زیردستوں کی آقائی

یعنی

طٰہ حسین مصری کی ایک معرکہ آرا کتاب "الوعد الحق"
کا شگفتہ ترجمہ جس کے آغاز میں طٰہ حسین کے
سوانح زندگی بھی شامل کر دئے گئے ہیں

از

مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی

یکے از مطبوعات

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ لاہور

معذرت

یہ کتاب ایک سال پہلے مکمّل ہو چکی تھی لیکن افسوس ہے بعض ناگزیر وجوہ سے اتنی تاخیر کے بعد آپ کے سامنے آرہی ہے۔

"الوعد الحق" کا ترجمہ ہے "سچا وعدہ" لیکن اس ترجمے سے کتاب کے مضمون کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی اس لئے میں نے اس کا نام "زیردستوں کا انجام" رکھا ہے

محمد جعفر

سوانح طہٰ حسین

طہٰ حسین بینا پیدا ہوا تھا مگر بچپن میں غلط علاج سے اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کے مکان کے سامنے ہی نرکل کا جنگل تھا۔ جہاں یہ بعد مغرب جا کر کھڑا ہو جاتا اور شاعروں کا کلام اور ترنم سُن کر لطف لیتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اس کی بہن اسے پکارتی کہ مکان کے اندر آ جاؤ۔ مگر یہ اپنی دلچسپی کو جاری رکھنے کے لئے آنے سے انکار کر دیتا۔ پھر یہ اسے کپڑے سے باندھ کر گود میں اُٹھا لیتی اور گھر کے اندر داخل ہو جاتی۔ اسے اس وقت سخت افسوس ہوتا۔ پھر خوابگاہ میں اپنی ماں کی ران پر سر رکھ کر لیٹ جاتا اور ماں اس کی آنکھوں کو چیر چیر کر دوا ٹپکاتی۔ مگر اسے کبھی بجز جلن کے اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد اسے دوسرے کمرے میں سلا دیا جاتا۔ جب اس کی آنکھ کھلتی اور یہ اپنے آس پاس بھائیوں بہنوں کے خراٹے سنتا تو ڈرتے ہوئے چادر کو اپنے چہرے سے سرکاتا۔ اسے یہ وہم ہوتا کہ اگر رات کے کسی حصے میں اس نے اپنا منہ یا کوئی حصۂ بدن چادر سے باہر نکالا تو کوئی نہ کوئی جن بھوت اس سے چمٹ جائے گا۔ یہ سمجھتا تھا کہ گھر کے کونے کونے میں بھوت پریت موجود ہیں۔ جو دن بھر تو زمین کی تہوں میں رہتے ہیں اور رات کی خاموشی میں روشنی گل ہوتے ہی باہر نکل پڑتے ہیں۔ سحر کے وقت جب مرغ اذان دیتے تو اسے یہ خیال ہوتا کہ کچھ بھوت وغیرہ بھی ان مرغوں کے ساتھ اذان دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ آوازیں دور سے آتیں اس لئے اسے خوف نہ ہوتا۔ البتہ کمرے کے قریب سے جب خفیف سی آوازیں آتیں ——

جیسے کوئی ہانڈی پک رہی ہو یا کوئی چیز اِدھر سے اُدھر ہٹائی جا رہی ہو یا لکڑی چیری جا رہی ہو — تو اسے ڈر لگتا تھا۔ کبھی اسے محسوس ہوتا کہ کچھ درویش ذکر و فکر میں مشغول ہیں۔ اس وقت بھی اسے ڈر آتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر چادر کو ہر طرف سے اچھی طرح لپیٹ لیا جائے تو حفاظت رہے گی ورنہ اگر ایک دانے کے برابر بھی چادر میں خلا رہ گیا تو بھوت گھس کر ستائے گا۔ غرض رات کو جب بھی آنکھ کھلتی تو نیند آنے تک وہ اسی قسم کے خوف سے پریشان رہتا۔ جب عورتوں کے چلنے اور گنگنانے کی آواز سنتا تو سمجھتا کہ اب صبح ہو گئی ہے اور بھوت سب زمین کے اندر چلے گئے۔ پھر وہ آپ ہی آپ باتیں کرتا یا شعر الاپتا اور اپنے بھائیوں بہنوں کو ایک ایک کر کے جگاتا اور ایک چہل پہل شروع ہو جاتی۔ پھر جب اس کا باپ وضو کیلئے لوٹا مانگتا تو ذرا شور کم ہو جاتا۔ باپ نماز اور وظیفہ ادا کر کے چائے پیتا اور اپنے کام پر چلا جاتا۔ اور دروازہ بند ہونے کے بعد پھر شور و غل، کھیل کود اور آمد و رفت شروع ہو جاتی۔

دنیا اس کے خیال میں اس نالے تک جا کر ختم ہو گئی تھی جو چند قدم پر واقع تھی اسے کیا معلوم کہ ایک نوجوان ایک چھلانگ میں نالے کے اُس پار جا سکتا تھا اور اگر اُتر جائے تو کمر کمر سے زیادہ کہیں پانی نہ تھا بلکہ بعض جگہ تو جا بجا خشک گڑھے بھی تھے جس میں مری ہوئی مچھلیاں بھی مل جاتی تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ نالے کے اُس پار کوئی اور الگ دنیا ہے جہاں انسانوں کو نگل جانے والے گھڑیال اور مچھلیاں ہیں۔ ان ہی مچھلیوں میں سے کسی کے شکم میں خاتم سلیمانی ہے جس کو گھمانے سے دو جن آ کر ہر خدمت بجا لاتے ہیں۔ اسے تمنا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی کسی مچھلی کے پیٹ میں اُتر کر یہ انگوٹھی حاصل کر لیتا اور ان جنوں سے کہتا کہ

نالے کے اس پار کے عجائب ذرا مجھے دکھا دو۔

یہ اپنے تیرہ۱۳ بھائیوں میں ساتواں، اور گیارہ۱۱ بہنوں میں پانچواں تھا۔ اسکی ماں اور باپ دونوں اس پر بڑے مہربان تھے۔ نابینا اور مجبور و ناکارہ ہونے کی وجہ سے والدین اور بھائی بہن کبھی کبھی اس کی طرف سے بے رُخی برتتے تھے جس کا اسے بھی احساس ہوتا تھا۔

ایک آدھ تلخ تجربوں کے بعد یہ کھانے پینے میں بڑا محتاط ہو گیا۔ گرنے پڑنے والی چیز کو ہاتھ نہ لگاتا۔ عموماً خشک چیزیں کھاتا۔ وہ لوگوں کو ہنسنے یا طنز کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔ کھیل کود کے قابل ہی نہ تھا۔ البتہ وہ مجمعوں میں الگ بیٹھ کر قصّے، گفتگوئیں، اشعار، جنگ و فتح کے واقعات، انبیاء اور صلحاء کی حکائتیں، مواعظ وغیرہ بڑے غور سے سُنا کرتا تھا اور ان کے سُننے والوں پر جو مختلف اثرات ہوتے ان کو بھی یہ خوب محسوس کرتا تھا۔ بچپن ہی میں اسے طربی اور المی قصّے، اشعار اور نوحے وغیرہ بہت سے یاد ہو گئے تھے اور اس کا بوڑھا ضعیف البصر دادا صبح و شام جو اوراد پڑھتا تھا اسے بھی اس نے سُن سُن کر یاد کر لیا تھا۔ نو سال کی عمر میں یہ حافظ بھی ہو گیا۔ لیکن ایسا حافظ جسے قرآن کی ایک سورت بھی یاد نہ ہو۔

جس میاں جی سے یہ پڑھتا تھا اور پھر جس اسسٹنٹ میاں جی کے سپرد کیا گیا وہ دونوں کے دونوں سخت لالچی، طماع، دروغ گو اور بدکردار واقع ہوئے تھے۔ ایک بار اس کے باپ نے اس کا امتحان لیا تو یہ صفر نکلا اور اس نے مارے شرم کے خودکشی کا ارادہ کیا اور اپنی گردن پر چھرا مار لیا۔ مگر بچ گیا۔ اور دوسرے میاں جی کو مقرر کیا گیا جو گھر پر آ کر اسے قرآن یاد کرا جاتے تھے۔ اس کے

بعد اسے پھر اسی میاں جی کے مدرسے میں جانا پڑا۔ اس کا بڑا بھائی جب ازہر سے واپس آیا تو اس کو آیندہ سال اپنے ساتھ ازہر لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور اس دوران میں اس سے کہا کہ الفیۃ ابن مالک کو زبانی یاد کر لے اور مجموعۃ المتون کے ضروری حصّوں کو بر زبان کر لے۔ نیز جوہرہ، خریدہ، سراجیہ، رحبیہ اور لامیۃ الافعال کو بھی پڑھ کر یاد کر لے۔ مدرسے کے میاں جی تو یہ کتابیں اسے پڑھا نہ سکتے تھے لہذا اسے ایک ازہری عالم کے پاس جو قاضی بھی تھے محکمۂ شرعیہ میں بھیجنا شروع کیا جہاں وہ ہر روز جاتا اور کچھ سبق لے کر واپس آتا اور اپنے باپ کو سُناتا۔ اس وقت وہ الفیہ ابن مالک پڑھا کرتا تھا۔ ابتدائی سبق تو اس نے بڑے ٹھاٹھ سے پڑھے مگر جب مبتدا کا بیان آیا تو وہ اُکتا سا گیا۔ اور الفیہ پڑھنے میں بالکل اس کا دل نہ لگا۔ باپ کو وہ ادھر اُدھر کے اشعار سُنا کر چکمہ دے دیتا کہ آج ہم نے یہ کچھ سبق پڑھا ہے۔

جب اس کا ازہری بھائی چھٹی گزارنے آیا تو اسے حقیقت حال معلوم ہوئی اور اس نے دس دن میں اسے الفیہ پڑھا کر یاد کرا دیا۔

اس کو جو کتابیں پڑھوا کر سُننے کے لئے ملتیں وہ عموماً وہ ہوتیں جو کتب فروش اس کے گاؤں (ریف) میں لا کر فروخت کرتے۔ ان میں صلحاء کے مناقب، جنگ و فتح، کہانیاں قصے، میلاد، صوفیانہ اشعار، مواعظ، مختلف قبائل کی داستانیں، اوراد و وظائف اور قرآن کے نسخے وغیرہ ہوتے اور ان ہی میں شمس المعارف الکبریٰ ہوتی جو جادو ٹوٹنے کی کتاب ہے۔ اسے ان کتابوں کے اکثر مضامین یاد ہو گئے۔ مگر دو چیزوں کی طرف اس کی رغبت خاص طور پر تھی۔ ایک تصوّف اور دوسرے عملیات۔ ان دونوں چیزوں میں اگرچہ ظاہری مناسبت کوئی نہیں لیکن حقیقۃً جذبہ ایک ہی ہے۔ صوفی بھی اپنے شغل کے متعلق یہ گمان رکھتا

ہے کہ غیب کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ کرامتیں حاصل ہو کر طبیعی قوانین کو توڑ دیں گی اور اسی قسم کی اُمید بن جادوگری کا شوقین بھی وابستہ کئے رہتا ہے۔ بس فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوفی کا تعلق ملائکہ سے ہوتا ہے اور جادوں کا شیاطین سے۔ ذہنوں میں یہی ہوتا ہے کہ جادو کے ذریعے دنیا حاصل ہو جائے گی اور تصوف سے قرب الٰہی۔ اس طرح دنیا و آخرت دونوں کا بھلا ہو گا۔

طٰہٰ حسین کو بھی اسی قسم کا شوق ہوا کہ تصوف سے خدا کو راضی کر لے اور جادو سے دنیا کا عیش حاصل کر لے۔ اس نے الف لیلہ بھی پڑھی جس کے ایک باب میں اس ڈنڈے کا ذکر تھا کہ اسے زمین پر مارا جائے تو زمین پھٹ کر تو اشخاص نکل آتے ہیں اور وہ جنوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ اُڑتے ہیں۔ بڑے بوجھ کو اٹھا لیتے ہیں۔ پہاڑ کو اُکھاڑ پھینکتے ہیں اور عجیب عجیب کارنامے دکھاتے ہیں۔

طٰہٰ حسین کو اس ڈنڈے کی خواہش اس قدر زیادہ ہوتی کہ وہ ایک رات دن اسی میں غلطاں و پیچاں رہا اور سو نہ سکا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا بھی اسی کی طرح اس ڈنڈے کا دیوانہ تھا۔ آخر دیرٔبی کی ورق گردانی کرتے ہوئے اسے یہ عمل ملا کہ: کسی تنہائی کی جگہ میں بیٹھ کر بخور جلاتے جاؤ اور یا لطیف کی تکرار کئے جاؤ۔ تو اس اسم کا موکل حاضر ہو جائے گا اور اس سے جو کہو گے وہ کر دیگا۔

طٰہٰ حسین نے یہ عمل کیا اور دو بار کیا لیکن نہ کوئی موکل آیا نہ جن دکھائی دیا۔

اسے ان عملیات کا شوق اس لئے بھی تھا کہ اس کا باپ کبھی کبھی اس سے سورۂ یٰسین کے مختلف وظائف کرایا کرتا تھا اور اس کی مُراد پوری ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے اس فرزند کو مبارک اور مقرب بارگاہ الٰہی تک سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اس نے ایک مجوّد سے کوئی سال بھر تجوید قرآن اور لہجہ سیکھا

اور تحفۃ الاطفال پوری پڑھ لی۔

اس کے بعد طہٰ حسین کو ایک سب سے چھوٹی چار سالہ بہن اور ایک شانزدہ سالہ بھائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا جس نے اس کے پورے گھر کا نقشہ بدل دیا اور سارا گھر خصوصاً والدین ہمیشہ مغموم رہنے لگے۔

اس کا ایک ازہری بھائی اسے قاہرہ اپنے ساتھ لے گیا جہاں اس نے تعلیم شروع کی یہاں اس نے تمام مروّجہ علوم ___ صرف، نحو، منطق، الٰہیات، حدیث، تفسیر، لغت، ادب وغیرہ ___ پڑھے۔ لیکن دو ایک کے سوا کسی استاد کا درس پسند نہ آیا۔ اسے ابتدا ہی سے مذہبی تنگ دلی سے نفرت تھی جس میں وہ تمام اساتذہ کو گرفتار پاتا تھا۔ علاوہ ازیں دو چیزیں اسے بہت کھلتی تھیں۔ ایک محدود علوم اور قدیم کتب کی جکڑ بندی اور علوم وکتب جدیدہ سے ازہریوں کی عام محرومی ونفرت۔ وہ اس جمود سے سخت متنفر تھا۔ اور اساتذہ ومعلّمین کے انداز و اطوار کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ چند ایک کا اس نے خود جو نقشہ کھینچا ہے اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ ایک استاد کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

یہ ۴۰ سال کا استاذ عالمیت کی سند لے کر پہلی بار معلم بن کر بیٹھا۔ یہ علم میں تو درک رکھتا تھا لیکن زندگی کے دوسرے اعمال و وظائف میں چوپٹ تھا۔ بڑا پیٹو تھا اور گوشت پر تو گدھ کی طرح گرتا تھا۔ آواز عجیب قسم کی تھی۔ اپنی کانپتی ہوئی آواز سے لفظ کے ایک ایک حرف کو توڑ توڑ کر بولتا تھا مگر پھر بھی ایک حرف دوسرے سے مل جاتا تھا۔ اس قدر منہ پھاڑ پھاڑ کر بولتا تھا کہ سننے والے بے ساختہ ہنس کر اس کی نقل اُتارنے پر مجبور ہو جائیں۔ عالمیت کی سند لیتے ہی اس نے علماء کا سا ڈھیلا ڈھالا لباس (فراجیہ) پہننا شروع کر دیا حالانکہ علماء بھی اس وقت یہ لباس اختیار کیا کرتے تھے جبکہ سند لئے عرصہ گزر چکا ہو اور علمی دھاک بیٹھ چکی ہو اور معاشی

الت بھی درست ہو چکی ہو لیکن اس اُستاد نے فوراً عالمانہ لباس کی نقالی کر کے
بہ اور اساتذہ کو ہنسنے اور مذاق اُڑانے کا موقع دیا۔ زیادہ ہنسی تو اس بات پر آتی کہ
فراجیہ پہن کر اپنی پاپوش کے اندر بھی گویا برہنہ پا ہوتا تھا۔ موزے نہیں پہنتا تھا
تو اس لئے کہ وہ خرید نہیں سکتا تھا یا اس سے بچنا چاہتا تھا۔ راستے میں چلتا تو
تکلف عالمانہ سنجیدگی و وقار اختیار کر کے ٹھسے سے چلتا مگر جوں ہی ازہر کے
روازے کے اندر قدم رکھتا بھاگنا شروع کر دیتا۔"

نحو کے ایک اُستاد کے متعلق لکھتا ہے:

"یہ متن کی شرح کرنے لگتا تو عجب مضحکہ خیز آواز ہوتی۔ یہ پڑھتا نہ تھا بلکہ گاتا
تھا اور گانا بھی ایسا جو سینے سے نہ اُبھرتا بلکہ سر سے نازل ہو رہا ہوتا۔ گھٹی ہوئی آواز کے
باوجود ذرا لمبی چوڑی قسم کی۔ لب ولہجہ اور راگ بالکل دہقانی تھا کیونکہ وہ خود بھی
دہقانی تھا ——— اور ازہر آ کر اس کے لب لہجے میں کوئی تغیر
نہیں آیا تھا۔ مزاج نہایت درشت تھا۔ پڑھنے کا انداز، سوال کرنے اور سوال کا
جواب دینے کا طریقہ نہایت غیر مہذب تھا۔ غصہ ناک پر رکھا رہتا تھا۔ جہاں کسی نے
کچھ پوچھا اور اس نے گالی سے بات شروع کی۔ اگر پوچھنے والا قریب ہوا تو ایک تھپڑ
یا گھونسا رسید کر دیا اور دور ہوا تو جوتا پھینک مارا۔ جوتا بھی ماشاء اللہ اس کی آواز
کی طرح بھدا اور اس کے کپڑوں کی طرح بھاری تھا جس میں کیلیں ٹھونکی ہوئی تھیں
اندازہ کر لیجئے کہ یہ پاپوش جس طالب علم کے منہ یا کسی حصہ جسم پر لگتی ہو گی اس کا کیا
حال ہوتا ہو گا! اسی ڈر سے طلبہ کوئی سوال کرتے ڈرتے تھے اور اسے پڑھ کر تفسیر و
تقریر کرنے اور گاتے رہنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ اپنا وقت ضائع
کرتا اور نہ طلبہ کا۔ نتیجہ یہ کہ سال تمام ہونے سے پہلے ہی یہ حضرت شرح کفراوی اور
شرح شیخ خالد پڑھا کر فارغ ہو گئے۔ یعنی دوسرے اساتذہ کی ایک کتاب بھی

ختم نہ ہوئی تھی اور اُنہوں نے دو کتابیں تمام کرلیں اور پھر بھی کسی کو ابتدائی نحو کا بھی علم نہ آسکا۔ آخر چھٹیوں کے بعد طہٰ حسین قاہرہ واپس آئے تو انہوں نے دوسرے استاذ سے حاشیۂ شرح عطار علی شرح الازہریہ نحو میں شروع کردی اور فقہ میں شرح الطائی علی الکنز۔

ایک اُستاذ نحو کا حال یوں لکھتا ہے:

تابّط شرّاً کے اس شعر کی تشریح کر رہے تھے:

فأبت الی فھم وما کُدت آئبا

وکم مثلھا فارقتھا وھی تصفر

اس شعر کے لفظ تصفر کی شرح اُنہوں نے یوں کی کہ عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب ان پر کوئی سخت مصیبت آتی تو وہ اپنی انگلیاں مُنہ میں ڈال کر زور سے ہوا نکالتے یا پھونکتے۔ اس سے سیٹی کی آواز (صفیر) پیدا ہوتی تھی"۔ طہٰ حسین نے پوچھا کہ پھر ھی اور فارقتھا کی ضمیر مؤنث کا مرجع اس شعر میں کون سا ہے؟ استاد نے جواب دیا کہ بے وقوف اس کا مرجع "فھم" ہے۔ (فھم عربی میں مذکر ہے) طہٰ حسین نے کہا کہ پھر تو اس شعر کا کوئی واضح مطلب ہی نہیں ہوا۔ استاد نے جواب دیا کہ تم بے شرم بدتمیز ہو اور تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ تم بے عقل بنے رہو۔ طہٰ حسین نے کہا کہ میرے متعلق تو آپ نے بجا فرمایا ہوگا مگر اس سے ضمیر کے مرجع کا پتہ نہیں چلا۔ اس کے بعد استاد نے طلبہ سے کہا کہ اب سبق بند کردو اور گھر جاؤ، جب تک یہ بے حیا بدتمیز تمہارے اندر موجود ہے میں کوئی سبق نہیں دوں گا۔ یہ کہہ کر اُستاد صاحب تو اُٹھ کھڑے ہوئے اور طلبہ طہٰ حسین پر جھپٹ پڑے۔ اور اگر بیچ بچاؤ نہ ہوا ہوتا تو یہ اُس دن پٹ گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد طہٰ حسین نے نحو کے سبق میں جانا چھوڑ دیا۔

ایک استاذ منطق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"یہ بڑے فخر و ناز کے ساتھ دعویٰ کرتا تھا کہ: مجھ پر خدا کا خاص فضل یہ ہے کہ میں دو گھنٹے مسلسل ایسی بلیغ تقریر کر سکتا ہوں جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے بلکہ خود میں بھی نہ سمجھ سکوں"۔ اس کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی طالب علم اس سے کچھ پوچھتا، تو یہ اس کا مذاق اُڑانے لگتا اور اگر دوبارہ دریافت کرتا تو جواب یوں دیتا کہ: چپ رہ بدبخت، سؤر (خاسر، خنزیر) اور لفظ خاسر و خنزیر کی خ کو خوب پڑ کر کے نکالتا۔ اسی طرح دوسرے موقعے پر دوسری گالیاں مثلاً چوپایو، جانورو، سؤرو وغیرہ بھی خوب حلق سے نکال کر کہا کرتا۔

اس قسم کے بہت سے تجربات نے طٰہٰ حسین کو ازہر سے متنفر کر دیا۔ اس نے اساتذہ کے علاوہ ازہر کی عام اخلاقی حالت کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ:

ایک صدر مدرس کے انتقال پر سارے مصر نے اظہار غم کیا لیکن خود ازہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ صرف مرحوم کے چند خاص شاگردانِ رشید مرحوم کا اکثر ذکر اور اظہارِ افسوس کرتے تھے۔ طٰہٰ حسین کو یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا کہ زندگی میں زیادہ تر لوگ تقرب حاصل کرنے کے لئے چاپلوسی اور منافقت سے کام لیتے تھے۔ مگر مرنے کے بعد انہوں نے پوچھا بھی نہیں۔ اس سے بھی زیادہ رنج یہ ہوا کہ اس کے مرتے ہی بعض لوگوں نے اس کے نام کی تجارت شروع کر دی اور نظم و نثر میں قصیدہ خوانی کر کر کے انعامات حاصل کئے جو دراصل استغلال (اکسپلائیٹیشن) تھا۔

طٰہٰ حسین کے دل پر سب سے زیادہ اس بات کا اثر ہوا کہ مرحوم کی جدائی پر واقعی دلی اخلاص سے رونے والے ازہر کے عمامہ بند طلبہ و اساتذہ نہ تھے بلکہ ترکی ٹوپی والے جدید تعلیم یافتہ حضرات تھے۔ اس سے طٰہٰ حسین کے دل میں

ازہر کی طرف سے نفرت اور ان تعلیمی فنون کی طرف رغبت پیدا ہونے لگی۔

ایک معلم ادب کا بھی طہٰ حسین نے ایک طویل واقعہ لکھا ہے جس کا ما حصل یہ ہے کہ یہ صاحب لفظِ "عمر" کو منصرف بتاتے تھے اور ثبوت میں خلیل کا شعر پڑھتے تھے ؎

یا یھا الزاہری علی "عُمَرَ"
قد قلت فیہ غیرُ ما تعلم

(حالانکہ یہاں ضرورتِ شعری سے "عمر" کو منصرف کیا گیا ہے)

اور یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس معلّم ادب کے متعلق مصر میں یہ مشہور ہے کہ بڑا کتب بین ہے قسطنطنیہ اور اندلس کا سفر کر چکا ہے۔ ادب، لغت، حد وغیرہ کا بڑا ماہر ہے۔

ایک اور معلم انشا و ادب کا حال لکھا ہے کہ مقامات بدیع الزمان میں ابو فراس کے ایک قصیدے کا ایک شعر یوں ہے ؎

بداوت واھلی حاضرون لانئی
اری ان دارا لستِ من اھلھا قفر

وہ معلم صاحب دوسرے مصرعے میں "دار اُلستِ" کو "دار السّتِ" پڑھتے اور پڑھاتے تھے۔

طہٰ حسین کے اندر بچپن ہی سے تقلیدی ذہنیت سے تنفّر تھا۔ یہ جدّت پسند تھا اور ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی تھا۔ محض خوش اعتقادی سے کسی بات کو تقلیداً تسلیم کر لینا اس کی فطرت میں نہ تھا۔ اپنے اسی جذبے کی وجہ سے اسے اپنے گاؤں کے ملاؤں سے نفرت سی ہوگئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ قاہرہ جا کر ازہر سے اسے حصول علم کا بہتر موقع ملے گا۔ ابتدائی دور کا ایک واقعہ بھی

اس نے مزے لے لے کر لکھا ہے کہ ایک مولانا کے درسِ فقہ میں اسے شرکت کا موقع ملا تو اس وقت وہاں وہ یہ پڑھا رہے تھے کہ :

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو یہ کہے کہ "تم طلاق ہو یا تم طلام ہو یا تم طلال ہو یا تم طلاۃ ہو" تو بہرحال طلاق پڑ جائے گی اور لفظی تغیر کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

اس قسم کے بہت سے تجربے اسے اپنے گاؤں میں بھی ہوئے اور خود ازہر میں بھی۔ اس سے وہ بہت دل برداشتہ ہوا اور غالباً یہی اس کے سمندر پار جانے کا بھی محرک ہوا۔

طٰہٰ حسین ان علماء کی تنگ دلی، فرقہ پرستی، محدود نظری اور قناعتِ علمی سے متنفر تھا۔ وہ علم کو محض ازہر کی چند کتابوں میں محدود نہیں سمجھتا تھا۔ مذہبی معاملے میں بھی شروع سے یہ آزاد خیال رہا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ناگوار حد تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ایک بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نابینا ہونے کے باوجود اس نے کبھی اپنے آپ کو مجبور اور قابلِ رحم تصوّر نہیں کیا، ہمت نہیں ہاری اور سخت سے سخت مراحل پر بھی علم کی پیاس میں کمی نہ آئی۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ تحصیلِ علم کو ہر شخص کا پیدائشی حق تصوّر کرتا ہے اور کسی قسم کی جکڑ بندی کا قائل نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس نے سفرِ یورپ کا ارادہ مکمل کیا۔ پیرس پہنچا۔ فرنچ زبان سیکھی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لایا۔

قاہرہ میں یہ صبح کو ازہر جاتا اور شام کو کالج کی حاضری دیتا جہاں اسے نئی قسم کی زندگی اور نئی سوسائٹی ملی۔ یہاں کے اساتذہ کے متعلق وہ خود لکھتا ہے کہ "ازہری اساتذہ کو ان سے کوئی نسبت نہیں"۔ یہیں سے اسے علومِ جدیدہ کی پیاس

پیدا ہوئی اور اس نے سمجھ لیا کہ محض چند درسی کتابوں میں علم محدود نہیں، بلکہ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد اسے پروفیسری بھی ملی۔ پھر یہ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بھی ہوا اور وزارتِ تعلیم کا مشیر بھی۔

اس کی تحریر کا انداز اور اسٹائل سب سے الگ ہے۔ پیشِ نظر کتاب ہی کو دیکھئے۔ ایک شخص کا ذکر شروع کرتا ہے اور ایک مقام پر پہنچ کر چھوڑ دیتا ہے۔ پھر دوسرے کا ذکر کرتا ہے اور اسے بھی ایک جگہ لاکر الگ ہوجاتا ہے۔ اس طرح کئی ایک کے ساتھ کرتا ہے پھر سبھوں کی کڑیاں آگے چل کر ملاتا ہے۔ واقعات تاریخی ہیں لیکن انداز ناولانہ ہے جس میں کہیں رومانی رنگ بھی بھرا ہے۔ البتہ اس کے پڑھنے کے بعد خواہ دل میں سیدنا عثمان ذی النورین کی طرف سے ایک سوئے ظن سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے طٰہ حسین نے کسی دوسری جگہ اس سوئے ظن کو دور کرنے کی کوشش کی ہو جو ہمارے علم میں نہیں لیکن اے کاش وہ کتاب ہی میں اس سوئے ظن کو دور کردیتے تو بہت اچھا ہوتا۔ تاہم پڑھنے والے کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ سیدنا عثمان ہوں یا کوئی اور کسی کی زندگی بشریت سے خالی نہیں۔ اوّل تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے کہ اُس وقت کے تقاضے کیا تھے اور واقعات کی نوعیت کیا تھی دوسرے یہ ہوسکتا ہے کہ تاریخی واقعات کے بعض حقائق تشنہ رہ گئے ہوں۔ اور ان تمام باتوں سے قطع نظر کسی انسان کو محض ایک دو واقعات سے ـــــ اور وہ بھی سوئے ظن پیدا کرنے والے واقعات سے ـــــ تولنا صحیح نہیں۔ انسان کی تمام زندگی اور اس کی مختلف کارگذاریوں اور اعمال کو پرکھنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کون سا پلّہ جھکا ہوا ہے۔ نیکی کا یا بدی کا۔ ہم پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیدنا عثمان کی ساری زندگی کی

نیکیوں کو دیکھنے کے بعد محض چند سوئے ظن پیدا کرنے والے واقعات سے فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔

طٰہٰ حسین مذہب کے معاملے میں روشن خیال آزاد واقع ہوئے ہیں۔ وہ فقہی موشگافیوں کے بجائے آزاد اور بلند افکار و کردار کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ نہوں نے اپنے مذہب کے متعلق ایک سوال کا جواب دیا ہے وہ سنئے۔ یہ مضمون امروز میں شائع ہوا تھا۔ اصل عبارت میرے سامنے موجود نہیں۔ مگر میں عبدالرحمان صاحب کے ترجمے کو اعتماد کے ساتھ نقل کرتا ہوں:

عربی دنیا کی ایک بین الاقوامی شخصیت جس نے تنگ حالی اور آنکھوں سے معذوری کے باوجود علم و تحقیق کی آخری منزلیں طے کیں۔ تعلیم کی ابتدا جامع ازہر سے کی۔ علم کی شدید پیاس آپ کو مختلف کتب خانوں میں لے گئی۔ جہاں آپ نے کچھ ایسے تحقیقی افکار حاصل کئے جن کی گذر جامع ازہر میں نہ ہو سکی۔ مصری یونیورسٹی کے قیام پذیر ہوتے ہی آپ اس میں شامل ہو گئے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر یورپ جانے والے پہلے تعلیمی وفد میں شریک ہوئے اور پیرس میں یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ واپسی کے بعد مصری یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ ادبیات مقرر ہوئے۔ پھر وزارتِ تعلیم کے مشیر متعین ہوئے۔ وفد پارٹی کے آخری زمانے میں فوجی انقلاب سے قبل آپ نے وزیر تعلیمات کا عہدہ سنبھالا اور اس وقت آپ کو اپنی دیرینہ آرزو "تعلیم کو عام کرنے اور تمام انسانوں کے لئے اسے سہل الحصول بنانے کا موقع ملا۔ قلمدانِ وزارت سنبھالنے سے قبل اور بعد آپ نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں ملک کی نمایندگی کی۔ ادبیات میں نوبل پرائز کے لئے آپ کا نام تجویز کیا گیا۔ مصر میں ادبیات کا انعام آپ نے حاصل کیا۔

ذیل کا مضمون ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ زندگی میں آپ نے کن چیزوں پر اعتقاد رکھا اور کس مذہب کے مطابق آپ نے زندگی گزاری؟ اس مقالہ کا عنوان اس سوال کا مختصر جواب ہے جس کی تفصیل پورے مقالہ میں ملاحظہ فرمائیے:

میرا خیال ہے کہ میں نے زندگی میں اپنے مذہب کو رفتہ رفتہ معلوم کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ مذہب بذاتِ خود تھوڑا تھوڑا کر کے بنتا رہا ہے۔ زندگی کے مختلف احوال و ادوار نے میری طبیعت کی گہرائیوں میں سے اسے نکالا، جس طرح رگِ سنگ سے پوشیدہ آگ نکالی جاتی ہے۔

سب سے پہلے مجھ پر میرے مذہب کا جو حصّہ ظاہر ہوا میرا خیال ہے کہ وہ علم کی شدید پیاس تھی جو بچپن سے میری رفیق رہی۔ ایسی پیاس جسے حصولِ علم کے بعد تسکین نہیں ہوتی۔ بلکہ علم اس کی شدّت و تیزی کو اور بڑھاتا ہے۔ میں علم کی ایک منزل طے کر لیتا تو وہی منزل مجھے اس سے اونچی اور اعلیٰ منزل کا شوق دلاتی۔

اس میں بذاتِ خود کوئی حیرت انگیزی نہیں۔ زندگی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ضرورتیں بڑھتی جائیں۔ پھر علم تو ایک بیش بہا دولت ہے اور جو اس کی لذّت سے آشنا ہو گیا اس کی روز افزوں علمی ضروریات کبھی ختم نہیں ہو سکیں گی۔ وہ ہر آن انہیں زیادتی اور تحقیق و تدقیق کا طالب رہے گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ آفت عنفوانِ طفولیت سے میرے لئے مقدر ہو چکی تھی اور اسی نے میرے اندر طلبِ علم کی چنگاری کو بھڑکا دیا تھا۔ اسی تڑپ نے مجھے بہت سی مصروفیتوں سے باز رکھ کر، دوسرے لوگوں کی بہت سی دلچسپیوں اور کھیلوں میں حصّہ لینے سے محروم کر دیا۔ اسی نے میرے پیدائشی شوق تحصیل علم کو آسان کر دیا اور میں نے درس و تدریس میں اپنی تمام قوتیں اور کوششیں صرف کر دیں۔ میری تمام سرگرمیاں اور خالی اوقات طلب علم کے لئے

وقف ہوگئے جنھیں دوسرے لوگ اپنی زندگیوں کے گوناگوں مسائل اور دوسری پریشانیاں دور کرنے میں صرف کرتے ہیں۔

مجھے عوام کی زبان زد ضرب الامثال میں سے کسی نے بھی اتنی مشکل میں نہیں ڈالا جتنا کہ اس قدیم عربی ضرب المثل نے مجھے پریشان کیا:

"لَابُدَّ مِمَّا لَيْسَ مِنْهُ بُدٌّ"

جس سے کوئی راہ فرار نہ ہو وہ لابدی ہے"

اور تمام عربی شاعری میں سے میں نے جس شعر کو سب سے زیادہ پسند کیا وہ ابوالعلاء المعری کا یہ شعر ہے ؎

وَهَلْ يَأْبَقُ الْاِنْسَانُ مِنْ مُلْكِ رَبِّهٖ

فَيَخْرُجَ مِنْ اَرْضٍ لَهٗ وَسَمَاءٍ!!

ترجمہ۔ کیا انسان اپنے رب کی بادشاہت سے بھاگ کر کسی ایسے مقام میں جا سکتا ہے جہاں نہ اس کی زمین ہو نہ اس کا آسمان۔

ابتدائی مشکلات

چنانچہ میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں اپنے نفس کو حتی الامکان اپنے پسندیدہ کام یعنی درس و تدریس کے لئے یکسوئی کا عادی و خوگر بنا لوں اور میں نے اواخر طفولیت اور آغازِ شباب میں ایسا ہی کیا یا کرنے کی کوشش کی لیکن بہت جلد مجھے معلوم ہوگیا کہ تحصیلِ علم کے ذرائع میرے لئے نہ صرف مشکل بلکہ بہت زیادہ مشکل ہیں۔ میں بقول ابوالعلاء المعری اپنے مددگار کے بغیر لاچار ہوں نہ کہیں جا سکتا ہوں، نہ آ سکتا ہوں، نہ چل پھر سکتا ہوں، نہ پڑھ سکتا ہوں۔ میرے لئے ہر وقت ایک رہبر و معین درکار ہے۔ اس زمانہ میں میرے درس و تدریس اور تحصیل علم کا طریقہ انتہائی تنگ اور محدود تھا جو ازہر سے شروع ہو کر ازہر میں ہی ختم

ہو جاتا تھا میں اسی محدود علم پر اکتفا کرنے اور اسی تنگ دنیا میں بود و باش پر مجبور تھا۔ میرے لئے بھی جملہ ازہر کے فارغ التحصیل حضرات کی طرح یہ لازمی تھا کہ اس محدود علم کو اوڑھنا بچھونا بنالوں۔ اسی کو حرفِ اوّل و آخر سمجھوں اور اس پر کسی اضافے کا طالب نہ رہوں۔ جس طرح جملہ ازہری اس پر کوئی اضافہ نہیں کرتے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

اس مقام پر میری ان خصلتوں میں سے ایک خصلت اُبھر کر سامنے آگئی۔ جس سے مل کر میری زندگی کا مذہب بنا ہے۔ اور وہ خصلت ہے صبر۔ مصائب کو حتی الامکان برداشت کرنا اور ان پر غلبہ حاصل کرنا۔ چنانچہ میں نے صبر کیا اور ازہر میں انواع و اقسام کی مشکلات طوعاً و کرہاً برداشت کیں۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک قسم کے خطرناک اقدام کی طرف ڈھکیلا جا رہا ہوں۔ جس کی جرأت اس زمانے میں میرے جیسے طلبہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں بعض احباب کے ساتھ ان علوم کو حاصل کرنے کے لئے کتب خانے کیوں نہ جاؤں۔ جن کی تحصیل ازہر میں ممنوع ہے؟ اور جونہی قدیم عربوں کے علوم و آداب مجھ پر منکشف ہوئے میرا دل ازہر سے برگشتہ ہو گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ انجام سے بے خطر ہو کر میں ازہر اور اس کے نظامِ تعلیم کا سختی سے مخالف اور اس میں انقلاب کا خواہاں ہوں۔ نیز یونیورسٹی جو اس زمانہ میں آئی تھی اس کے لکچروں میں حصہ لینے کا انتہائی شوقین ہو گیا ہوں۔ یہاں میری زندگی کے مذہب کی تیسری خصلت اُبھری۔ اور وہ ہے علم کے لئے راستے میں حائل ہونے والی مشکلات کا جم کر مرتے دم تک مقابلہ کرنا اور میں نے عزمِ مصمم کر لیا کہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد طلبِ علم کے لئے سمندر پار کر کے یورپ جاؤں گا۔

میرے دل سے بار بار سوال اُٹھتا کہ مجھ جیسا شخص طلبِ علم کے لئے سمندر پار کر کے ایک ایسے اجنبی ملک میں کیسے پہنچ سکتا ہے جہاں کی ہر چیز اس کے لئے نئی ہو گی؟

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن میں ہمیشہ یہی کہتا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مجھے بہر حال سمندر پار جاکر مغربی تعلیم گاہوں سے علم حاصل کرنا ہے۔

تلاشِ علم میں سفر

اور پھر ایک دن میں نے اپنی آرزو پوری ہوتے دیکھ لی اور زندگی کی یہ سب سے کٹھن گھاٹی عبور کرنا بھی میرے لئے آسان ہوگیا۔ میرے پاس نہ تھوڑی دولت تھی نہ زیادہ۔ اور نہ میرے گھر والوں کے خیال میں یہ بات آسکتی تھی کہ وہ میرے لئے اتنا عظیم الشان خطرہ مول لے سکیں۔ وہ جب میرے اس قسم کے خیالات سنتے تھے تو اسے میرا ایک سہانا خواب اور میری زندگی کی تلخیوں کو مٹانے والی ایک تسلی بخش آرزو تصوّر کرتے تھے۔

میں محنت کے ساتھ یورپ کی زبان سیکھنے لگا اور ایسے انجام پر پہنچ گیا جو میرے خاندان، دوست، احباب اور ان لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا، جنھوں نے دور یا قریب سے مجھے پہچانا تھا اور بالآخر ایک دن آیا کہ میں جہاز میں بیٹھ کر سمندر پار کر رہا تھا۔ یہ پُرخطر اقدام کرکے میں نے اپنے گھر والوں اور دوستوں کو بڑی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ یہ مرحلہ اس زمانہ میں کوئی آسان کام نہیں تھا۔

مجھے اپنی خصلتوں میں سے صبر و اولو العزمی کی فرانس میں جس قدر شدید ضرورت محسوس ہوئی اتنی زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے وہاں اپنے گرد و پیش کی ہر چیز اور ہر انسان نیا معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح وہاں کی ہر چیز اور ہر شخص نے مجھے اجنبی سمجھا۔ لیکن صبر اور غیر متزلزل قوّتِ برداشت ہی وہ خصلتیں ہیں جنھوں نے لوگوں اور چیزوں کو موقع دیا کہ وہ مجھے سمجھیں اور انھیں خصلتوں کی مدد سے میں فرانس میں باوجود ابتدائی مشکلات و مصائب کے زندہ رہا اور بالآخر پہلے دو سالوں کے بعد وہاں کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہونے لگیں۔

اب میں مصر واپس آتا ہوں لیکن اس لئے نہیں کہ میرے خاندان والوں کی

تمنائیں پوری ہوں اور میں ازہر کے حلقوں میں سے ایک حلقے میں بیٹھوں۔ بلکہ اس لئے کہ میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہو جاؤں۔ پھر میں لوگوں کی عام زندگی میں شریک ہو گیا جو اس زمانہ میں نہایت سخت تھی۔ مصریوں اور انگریزوں میں سخت مقابلہ ہو رہا تھا۔ خود مصر کی اندرونی جماعتوں میں کش مکش جاری تھی۔ چنانچہ دوسرے ہموطنوں کی طرح میں نے بھی ان بار ہائے گراں سے اپنا حصہ اٹھا رکھا تھا۔

بے باکانہ حق گوئی

لیکن اب نئے حالات نے جن میں یورپ سے واپسی کے بعد میں مصر پہنچا، میری ان خصلتوں میں سے ایک نئی خصلت کو ظاہر کیا جن سے مل کر میری زندگی کا مذہب وجود پذیر ہوا ہے اور وہ خصلت ہے علی الاعلان حق گوئی و بے باکی اور ڈٹ کر مخالفینِ حق کا مقابلہ کرنا، خواہ اس کے نتائج کتنے ہی تلخ اور تکلیف دہ کیوں نہ ہوں۔

اب میں سیاست میں ٹکر لینے لگا۔ اجتماعی جھڑپیں ہونے لگیں۔ مصری عقل کی تجدید، نصاب تعلیم کی تبدیلی، طرزِ تحقیق میں تغیر پر جھگڑنے لگا۔

مصر میں ادب و تاریخ کے مطالعے کے لئے یورپ کے جدید اسالیب اپنانے اور انھیں لازمی قرار دینے کے لئے میں نے شدید مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔

میرے اس طرزِ عمل نے نئے نئے جھگڑے اُٹھائے، میرے خلاف دلوں میں رنجشیں ڈالیں اور میں نے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا اور خود کو سخت مشقت و کلفت میں مبتلا کر لیا۔ بیک وقت میں نے پارلیمنٹ کی اکثریت اور فرمانروائے مصر کو خفا کر لیا۔ بایں ہمہ نہ میں ہچکچایا نہ پیچھے ہٹا بلکہ یہ مصیبت اقدام اور اولوالعزمی میں مجھے تیز تر کر دیتی۔ میں صبر، اولوالعزمی، بیباکی سے اپنے مقصد میں بڑھتا چلا جاتا اور جسے حق سمجھتا اس کے لئے کوشاں رہتا۔ مجھے مقصد کے حصول میں غصہ ہونے والوں کا غصہ اور خوش ہونے والوں کی خوشنودی کی قطعاً پرواہ نہ ہوتی۔ میں یونیورسٹی سے کنارکش ہو جاتا

روز ہی کی تلاش جاری رکھتا۔ انواع واقسام کی دھمکیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا اور یہ حالات میرے عزم وہمت اور بے باکی کو قطعاً نقصان نہ پہنچاتے بلکہ مجھے حصول مقصد کے لئے تیز تر کرنے میں مہمیز کا کام دیتے۔ اس طرح ان تمام مشکلوں اور مخالفتوں پر جو مختلف اطراف سے مجھ پر حملہ کر رہی تھیں غالب آ گیا۔ گو یہ غلبہ تھوڑی مدّت کے لیے تھا لیکن بالآخر میرے لئے مقدّر ہُوا۔

علم حاصل کرنا سب کا حق ہے

اور اس وقت زندگی میں میرے مذہب کی وہ آخری خصلت سامنے آئی جو ابتک باقی ہے اور وہ ہے تمام لوگوں کے لئے میری خواہش کہ وہ سب بھی طلب علم اور علم میں اضافہ و وسعت کے لئے بغیر ان تکالیف کا مقابلہ کئے ہوئے جنہیں میں نے برداشت کیا تھا اور بغیر ان آزمائشوں میں پڑے ہوئے جن میں مبتلا ہو کر میں نے نئی نئی پریشانیاں جھیلیں میرا جیسا شوق اور میری جیسی تشنگی پالیں۔ چنانچہ میں نے لوگوں کو اس طرف دعوت دی اور باوجود حکومت وقت کی مخالفت کے میں نے باصرار اپنی دعوت کو جاری رکھا۔ لوگ میری دعوت سُن رہے تھے اور اس پر لبیک کہہ رہے تھے مگر حکومت مجھ سے اور لوگوں سے تنگ آ رہی تھی لیکن بالآخر اسے لوگوں کے بڑھتے ہوئے پُر زور مطالبے کے بعض حصّے کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا جسے اس نے نہایت تردد اور بخل کے بعد بادلِ ناخواستہ قبول کیا۔ پھر خود مجھے ایک بار حکومت میں شرکت کا موقع مل گیا اور اس وقت مجھے شرم آئی کہ میں لوگوں کے اس مطالبے کو پورا نہ کروں جس کا خود میں نے انھیں سبق دیا ہے۔ یعنی تعلیم کو عام کرنا اور تمام لوگوں کے لئے تعلیم کو آسان و سہل الحصول بنانا چنانچہ میں نے اس راہ میں اپنی تمام امکانی کوششیں صرف کر دیں اور حکومت کو نہ چھوڑا تا وقتیکہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ علم ان کا حق ہے اور ان سب کو آزادی سے اسے طلب کرنے کا

برابر برابر حق ہے اور اس راہ میں ان کے لئے کسی قسم کی کوئی مشکل اور تنگی حائل نہیں ہو سکتی۔

میرا مذہب

اس طرح میں نے اپنے نفس کی ان خصلتوں کو پالیا جن کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے مل کر زندگی میں میرا مذہب بنایا ہے اور وہ یہ ہیں :

علم کی شدید تشنگی جس کی تسکین کی کوئی صورت نہیں، مصائب پر صبر، ناسازگار حالات پر غلبہ، انجام کا خیال کئے بغیر دشواریوں میں کود جانے کا شوق، حق کو علی الاعلان بے باکانہ پیش کر دینا پھر اجتماعی خوش حالی کے لئے اس بات کا قوی احساس کہ جو خیر اپنے نفس کے لئے پسند کی جائے وہی دوسرے لوگوں کے لئے بھی پسند کی جائے۔

کیا اس مذہب نے زندگی میں مجھے لوگوں کی مطلوبہ سعادت و کامرانی سے ہمکنار کیا جس کے بعد نفس سکون و آرام، قلب طمانیت و راحت اور مسرت و خوشنودی محسوس کرتا ہے ؟

افسوس! یہ سعادت زندگی میں میرے جیسے کے لئے مقدر نہیں کی گئی اور بھلا یہ سعادت مسرت و خوشنودی مجھے کیونکر میسر ہو سکتی ہیں جبکہ میری طبیعت کسی چیز پر ٹھہرتی ہی نہیں۔ ایک چیز پالینے کے بعد وہ اس سے بلند تر چیز کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور جب بھی میں نے اپنے نفس یا لوگوں کی کسی آرزو کو پورا کیا میرے سامنے ایک دوسری آرزو کھڑی ہو گئی جس کی تکمیل پہلی آرزو سے زیادہ دشوار تھی۔ لوگوں کو یہ سعادت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب انھیں فلسفے کا کوئی ایسا حصّہ مل جاتا ہے جو مجھے نہیں ملا یا ان کے دلوں، عقلوں اور نفوس کو وہ فراغت نصیب ہو جائے جو مجھ کو نصیب نہیں ہوئی۔

اگرچہ غیر محدود آرزو اور پیہم عمل جس سے کبھی سکون و آرام نصیب نہ ہو سعادت کا بڑا حصہ ہے لیکن اگر سعادت ایسی خوشنودی کا نام ہو جس میں خفگی کی آمیزش نہ ہو یا ایسی راحت کا نام ہو جس میں کوئی تھکن اور کوفت کا امتزاج نہ ہو اور ایسی خوش حالی اور آسودگی کا نام ہو جس میں کبھی کوئی تنگ حالی نہ ملی ہو تو میں نے ایسی سعادت کا مزہ آج تک نہیں چکھا، اور میرا خیال ہے کہ میں اسے اس وقت تک کبھی نہیں چکھ سکوں گا جب تک اللہ تبارک و تعالےٰ مجھے اس دنیا کے بعد آنے والی زندگی میں اس سے ہمکنار نہ کردے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں طٰہٰ حسین کے طرزِ تحریر کا ایک نمونہ پیش کردیں۔ اصل عبارت کا زور دوسری زبان میں منتقل کرنا تو مشکل ہے تاہم وہی اسپرٹ ادا کرنے کی کوشش کرینگے۔ ہم پہلے عربی عبارت نقل کرینگے تاکہ عربی داں حضرات خوبی انداز کرسکیں۔ اور غیر عربی داں محض ترجمے سے لطف اٹھائیں۔ طٰہٰ حسین اپنے گاؤں میں تھے کہ ان کی ایک خرد سال بہن اور ایک بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ اس کا پورا نقشہ انہوں نے جس ڈرامائی انداز سے کھینچا ہے وہ یوں ہے:

وکذلک اتّصلت ایام الصبیّ بین البیت والکتاب والمحکمة والمسجد وبیت المفتش ومجالس العلماء وحلقات الذّکر، لاهی بالحلوة ولا هی بالمرّة، ولکنها تحلو حیناً وتمرّ حیناً آخر وتمضی فیما بین ذلک فاترة سخیفة۔ حتی کان یوم من الایّام ذاق الصبیّ فیه الالم حقاً، وعرف منذ ذلک أنّ تلک الآلام التی کان یشقی بها ونکره من اجلها الحیاة لم تکن شیئاً، وان الدهر قادر علی ان یؤلم الناس ویؤذیهم، ویحبّب الیهم الحیاة یهون من أمرها علی نفوسهم فی وقتٍ واحد، کانت للصبیّ اخت هی صغری

أبناء الأسرة، كانت فى الرابعة من عمرها كانت خفيفة الروح طلقة الوجه فصيحة اللسان عذبة الحديث قوية الخيال، كانت لهو الأسرة كلها، كانت تخلو إلى نفسها ساعات طوالاً فى لهو وعبث، تجلس إلى الحائط فتتحدث إليه كما تتحدث أمها إلى زائراتها، وتبعث فى كل اللعب التى كانت بين يديها روحاً قوياً وتسبغ عليها شخصية فهذه اللعبة امرأة، وهذه اللعبة رجل، وهذه اللعبة فتى، وهذه اللعبة فتاة، والطفلة بين هؤلاء الأشخاص جميعاً تذهب وتجئ، وتصل بينها الأحاديث مرة ثالثة فى هدوء واطمئنان وكانت الأسرة كلها تجد لذة قوية فى الاستماع إلى هذه الأحاديث والنظر إلى هذه الألوان من اللعب دون أن ترى الطفلة أو تسمع أو تحس أن أحداً يرقبها.

فما هى إلا أن أقبلت بوادر عيد الأضحى فى سنة من السنين، وأخذت أم الصبى تستعد لهذا العيد، تهيئ له الدار وتعد له الخبز وألوان الفطير وأخذ إخوة الصبى يستعدون لهذا العيد، يختلف كبارهم إلى الخياط حيناً، وإلى الحذاء حيناً آخر، ويلهو صغارهم بهذه الحركة الطارئة على الدار. فينظر صبينا إلى أولئك وهؤلاء فى شىء من الفلسفة كان قد تعوده، فلم يكن فى حاجة إلى أن يختلف إلى خياط أو حذاء، وما كان ميالاً إلى اللهو بمثل هذه الحركات الطارئة، وإنما كان يخلو إلى نفسه ويعيش فى عالم من الخيال يستمده من هذه القصص والكتب المختلفة التى كان يقرؤها فيسرف قراءتها.

أقبلت بوادر هذا العيد، وأصبحت الطفلة ذات يوم فى شىء من الفتور والهمود لم يكد يلتفت إليه أحد - والأطفال فى القرى

ومُدُنِ الأقاليم معرّضون لهذا النوع من الإهمال، ولا سيّما إذا كانت الأسرة كثيرة العدد ربة البيت كثيرة العمل، ولنساء القرى ومُدن الأقاليم فلسفة آثمة وعلم ليس أقلّ منها إثما. يشكو الطفل، وقلّما تُعنى به أمّه.... وأيّ طفل لا يشكو! إنما هو يوم وليلة ثم يفيق ويبل فإن عنيت به أمُّه فهي تزدري الطبيب أو تجهله، وهي تعتمد على هذا العلم الآثم، علم النساء وأشباه النساء. وعلى هذا النحو فقد صبينا عينيه، أصابه الرّمد فاهمل أياما، ثم دُعي الحلاق فعالجه علاجا ذهب بعينيه وعلى هذا النحو فقدت هذه الطفلة الحياة، ظلّت فاترةً هامدةً محمومةً يوما ويوما ويوما. وهي ملقاة على فراشها في ناحيةٍ من نواحي الدار، تُعنى بها أمُّها أو أختها من حين إلى حين، تدفع إليها شيئاً من الغذاء الله يعلم أكان جيّداً أم رديئاً. والحركة متصلة في البيت: يُهيّأ الخبز والفطير في ناحية، وتُنظف المنظرةُ وحجرةُ الاستقبال في ناحية أُخرى، والصّبيان في لهوهم وعبثهم، والشبّان في ثيابهم وأحذيتهم، والشيخ يغدو ويروح ويجلس إلى أصحابه آخر النهار وأوّل الليل.

حتى إذا كان عصر اليوم الرابع وقف هذا كلّه فجأة وعرفت أمّ الصبي أن شيئاً مخيفاً يحلّق على هذه الدار، ولم يكن الموت قد دخل هذه الدار من قبل، ولم تكن هذه الأمّ الحنون قد ذاقت لذع الألم الصحيح. نعم! كانت في عملها وإذا الطفلة تصيح صياحاً منكراً، فتدع أُمها كل شيء وتسرع إليها. والصياح يتّصل ويزداد، فتدع أخوات الطفلة كل شيء وتسرعن إليها. والصياح يتصل ويشتدّ، والطفلة تتلوّى

وتضطرب بين ذراعى أمها، فيدع الشيخ أصحابه ويسرع إليها. والصياح يتصل ويشتد، والطفلة ترتعد ارتعاد المنكر، ويتقبض وجهها ويتصبب العرق عليه، فينصرف الصبيان والشبان عما هم فيه من لهو وحديث ويسرعون إليها. ولكن الصياح لا يزداد إلا شدة، وإذا هذه الأسرة كلها واجمة مبهوتة محيطة بالطفلة لا تدرى ماذا تصنع!.....

ويتصل ذلك ساعة وساعة. فأما الشيخ فقد أخذه الضعف الذى يأخذ الرجال فى مثل هذه الحال فينصرف مهمهما بصلوات وآيات من القرآن يتوسل بها إلى الله وأما الشبان والصبيان فيتسلون فى شىء من الوجوم لا يكادون ينسون ما كانوا فيه من لهو وحديث ولا يكادون يستأنفونه هم كذلك حيارى فى الدار، وامهم جالسة واجمة تحدق إلى ابنتها وتسقيها ألوانا من الدواء لا أعرف ما هى والصياح متصل مشتد، والاضطراب مستمر متزايد.

ماكنت أحسب أن فى الأطفال ولما يتجاوزوا الرابعة قوة تعدل هذه القوة. وتأتى ساعة العشاء وقد مدت المائدة مدتها كبرى أخوات الصبى. وأقبل الشيخ وبنوه فجلسوا إليها. ولكن صياح الطفلة متصل فلا تمد يد إلى طعام، وإنما يتفرقون جميعا، وترفع المائدة كما مدت. والطفلة تصيح وتضطرب، و أمها تحدق إليها حينا وتبسط يدها إلى السماء حينا آخر، وقد كشفت عن رأسها وما كان من عادتها أن تفعل، ولكن ابواب السماء كانت قد أغلقت فى ذلك اليوم، فقد سبق القضاء بما لا بد منه. فيستطيع الشيخ أن يتلو القرآن، وتستطيع هذه الأم أن تتضرع. ومن غريب

الأمر أن أحداً من هؤلاء الناس جميعاً لم يفكر في الطبيب. وتقدّم الليل وأخذ صياح الفتاة يهدأ، وأخذ صوتها يخفت، وأخذ اضطرابها يخفّ، وخيّل إلى هذه الأم التعسة أن قد سمع الله لها ولزوجها، وأن قد أخذت الأزمة تنحلّ، وفي الحق أنّ الأزمة كانت قد أخذت تنحلّ، وانّ الله كان قد رأف بهذه الطفلة، وأنّ خفوت الصوت وهدوء هذا الاضطراب كانا آيتي هذه الرأفة. تنظر الأمّ إلى ابنتها فيخيّل إليها أنها ستنام ثمّ تنظر فإذا هدوء متصل لا صوت ولا حركة، وإنما هو نفس خفيف شديد الخفّة يتردّد بين شفتين مفتحتين قليلا، ثم ينقطع هذا النفس، وإذا الطفلة قد فارقت الحياة.

ماذا كانت علّتها؟ كيف ذهبت بحياتها هذه العلّة؟ الله وحده يعلم هذا!

وهنا يرتفع صياح آخر يتصل ويشتد. وهنا يظهر اضطراب آخر يتصل ويشتدّ. ولكنه ليس صياح الطفلة ولا اضطرابها، و قد أحسّت الثكل وإذا الشبان والصبيان قد فزعوا إلى أمّهم وسبقهم إليها الشيخ. وإذا هي في جزع وهلع ينطق لسانها بألفاظ لا صلة بينها، ويقطّع الدمع صوتها تقطيعاً، وإذا هي تلطم خديها في عنف متّصل. وزوجها ماثل أمامها لا ينطق لسانه بحرف، وإنما تنهمر دموعه انهماراً وإذا الجارات والجيران قد سمعوا هذا الصياح فأقبلوا مسرعين. فأمّا الشيخ فينصرف إلى الرجال يتقبّل عزاءهم في قوّة وجلد. وأمّا الشبّان والصبيان فيتفرقون في

الدار، قد قست قلوب بعضهم فنام، ورقّت قلوب بعضهم فسهر. وأمّا الأمّ ففيما هي فيه من جزع وهلع، أمامها ابنتها هامدة جامدة تولول وتخمش وجهها وتلطم صدرها، ومن حولها بناتها وجاراتها يصنعن صنيعها يولولن ويخمشن الوجوه ويصككن الصدور حتى ينقضي الليل كلّه.

وما أشد نكر هذه الساعة التي أقبل فيها بعض الناس و احتملوا الطفلة ومضوا بها إلى حيث لا تعود! كان ذلك اليوم يوم الأضحى وكانت الدار قد هيّئت للعيد، وكانت الضحايا قد أعدّت فيا له من يوم، ويا لها من ضحايا! ويا نكرها من ساعةٍ حين عاد الشيخ إلى داره مع الظهر وقد وارى ابنته في التراب!...

منذ ذلك اليوم اتّصلت الأواصر بين الحزن وبين هذه الأسرة فما هي إلا أشهر حتى فقد الشيخ أباه الهرم وما هي إلا أشهر أخرى حتى فقدت أمّ الصبيّ أمها الفانية وإنما هو حداد متصل وألم يفقد بعضه بعضاً، منه اللاذع ومنه الهادئ حتى كان هذا اليوم المنكر الذي لم تعرف الأسرة يوماً مثله، والذي طبع حياتها بطابع من الحزن لم يفارقها والذي ابيضّ له شعر الأبوين جميعاً، والذي قضى على هذه الأمّ أن تلبس السواد إلى آخر أيامها، وألا تذوق للفرح طعماً، ولا تضحك إلا بكت إثر ضحكها، ولا تنام حتى تريق بعض الدموع، ولا تفيق من نومها حتى تريق دموعاً أخرى، ولا تطعم فاكهة حتى تطعم منها الفقراء والصبيان، ولا تبتسم لعيد ولا تستقبل يوم سرورٍ إلا وهي كارهة راغمة.

وكان هذا اليوم يوم ٢١ أغسطس من سنة ١٩٠٢ - وكان الصيف منكراً في هذه السنة - وكان وباء الكوليرا قد هبط مصر ففتك بأهلها فتكاً ذريعاً، ودمّر مدناً وقرىً، ومحا أسراً كاملة . وكان (سيدنا) قد أكثر من الحُجب وكتابة المخلفات، وكانت المدارس والكتاتيب قد أُقفلت وكان الأطباء ورسل مصلحة الصحة قد انبثّوا في الأرض ومعهم أدواتهم وخيامهم يحجزون فيها المرضى، وكان الهلع قد ملأ النفوس واستأثر بالقلوب، وكانت الحياة قد هانت على الناس، وكانت كلُّ أسرة تتحدّث بما أصاب الأُسَرَ الأُخرى وتنتظر حظها من المصيبة - وكانت أُمُّ الصبي في هلع مستمرّ، وكانت تسأل نفسها ألف مرّة في كل يوم بمن تنزل النازلة من أبنائها وبناتها - وكان لها ابن في الثامنة عشرة، جميل المنظر رائع الطلعة نجيب ذكيّ القلب، وكان أنجب الأسرة وأذكاها وأرقها قلباً، وأصفاها طبعاً، وأبرّها بأمّه، وأرأفها بأبيه، . . . . وأرفقها بصغار إخوته وأخواته، وكان مبتهجاً دائماً، وكان قد ظفر بشهادة (البكالوريا) وانتسب إلى مدرسة الطب، وأخذ ينتظر آخر الصيف ليذهب إلى القاهرة - فلمّا كان هذا الوباء، اتّصل بطبيب المدينة وأخذ يرافقه ويقول : إنه يتمرّن على صناعته، حتى كان يوم ٢١ أغسطس -

أقبل الشباب آخر هذا اليوم كعادته باسماً، فلاطف أُمّه وداعبها وهدّأ من روعها وقال : لم تُصَبِ المدينةُ اليوم بأكثر من عشرين إصابةً، وقد أخذت وطأة الوباء تخف، ولكنه مع ذلك شكا من بعض الغثيان، وخرج إلى أبيه فجلس إليه وحدثه كعادته، ثم ذهب

إلى أصحابه ورافقهم إلى حيث كان يذهب معهم فى كل يوم عند شاطئ الإبراهيمية. فلما كان أول الليل عاد وقضى ساعة فى ضحك وعبث مع إخوته. وفى هذه الليلة زعم لأهل البيت جميعاً أن فى أكل الثوم وقاية من الكوليرا، وأكل الثوم وأخذ كبار إخوته وصغارهم بالأكل منه، وحاول أن يقنع أبويه بذلك فلم يوفق.

وكانت الدار هادئة مغرقة فى النوم كبارها وصغارها وحيوانها عندما انتصف الليل. ولكن صيحة غريبة ملأت هذا الجو الهادئ فهب لها القوم جميعاً. فأما الشيخ وزوجته فكانا فى هذا الدهليز المنبسط الذى تظله السماء يدعوان ابنهما باسمه. وأما الشبان من أهل الدار فكانوا يثبون من فراشهم مسرعين إلى حيث الصوت. وأما الصبيان فكانوا يجلسون يحكون أعينهم بأيديهم يحاولون أن يتبينوا فى شىء من الهلع من أين يأتى الصوت وماذا كانت الحركة الغريبة!

وكان مصدر هذا كله صوت هذا الفتى وهو يعالج القئ. وكان الفتى قضى ساعة أو ساعتين يخرج من الحجرة على أطراف قدميه ويمضى إلى الخلاء ليقئ مجتهداً ألا يوقظ أحداً. حتى إذا بلغت العلة منه أقصاها لم يملك نفسه ولم يستطع أن يقئ فى لطف، فسمع أبواه هذه الحشرجة ففزعا لها وفزع معهما أهل الدار جميعاً.

إذن فقد أصيب الشاب، ووجد الوباء طريقه إلى الدار، وعرفت أم الفتى بأى أبنائها تنزل النازلة. لقد كان الشيخ فى تلك الليلة خليقاً بالإعجاب حقاً، كان هادياً رزيناً مروعاً مع ذلك، ولكنه يملك نفسه. وكان فى صوته شئ يدل على أن قلبه مفطور، وعلى أنه مع ذلك جلد مستعد لاحتمال النازلة. آوى ابنه إلى حجرته

وأمر بالفصل بينه وبين بقية إخوته، وخرج مسرعاً فدعا جارين من جيرانه، وما هي إلّا ساعة حتى عاد ومعه الطبيب.

وفي أثناء ذلك كانت أمّ الفتى مروّعة جلدةً مؤمنةً تُعنى بابنها، حتى إذا أمهله القيء خرجت إلى الدّهليز فرفعت يدها ووجهها إلى السماء وفنيت في الدعاء والصلاة، حتى تسمع حشرجة القيء فتسرع إلى ابنها تُسنده إلى صدرها وتأخذ رأسه بين يديها، ولسانها مع ذلك لا يكفّ عن الدعاء والابتهال.

ولم تستطع أن تحول بين الصبيان والشبّان وبين المريض، فملؤا عليه الحجرة وأحاطوا به واجمين، وهو يُداعب أمّه كلما أمهله القيء، ويعبث مع صغار إخوته. حتى إذا جاء الطبيب فوصف ما وصف وأمر بما أمر وانصرف على أن يعودَ مع الصبح، لزمت أمّ الفتى حجرة ابنها، وجلس الشيخ قريباً من هذه الحجرة واجماً لا يدعو ولا يصلي ولا يجيب أحداً من الذين كانوا يتحدثون إليه.

واقبل الصبح بعد لأي، واخذ الفتى يشكو ألماً في ساقيه. وأقبلت إليه أخواته يدلكن له ساقيه، وهو يشكو صائحاً مرّةً كاتماً ألمه مرّةً أخرى القيء يجهده ويخلع في الوقت نفسه قلب أبويه. وقضت الاسرةُ كلها صباحاً لم تقضِ مثله قطّ: صباحاً واجماً مظلماً فيه شيء مفزع مروّع. فأمّا خارجُ الدار فكان يزدحم بالناس أقبلوا إلى الشيخ يُواسونه. وأمّا داخلُ الدار فكان يزدحم بالنساء أقبلن يُواسين أمّ الفتى. وكان الشيخ وزوجه عن أولئك وهؤلاء في شغل. وكان الطبيب يتردّد بين ساعة وساعة! وكان الفتى قد طلب

أن يبرق إلى أخيه الأزهريّ فى القاهرة وإلى عمه فى أعلى الإقليم. وكان يطلبُ الساعة من حين إلى حين ينظر فيها كأنّه يتعجلّ الوقت، وكأنه يشفق أن يموت دون أن يرى أخاه الشبابّ وعمّه الشيخ. يا لها من ساعة منكرةٍ هذه الساعة الثالثة من الخميس ٢١ أغسطس سنة ١٩٠٢.

انصرف الطبيب من الحجرة يائساً، وكأنّه قد أسرّ إلى رجلين من أقرب أصحاب الشيخ إليه بأنّ الفتى يحتضر فأقبل الرجلان حتّى دخلا الحجرة على الفتى ومعه أمّه. ظهرت فى هذا اليوم لأوّل مرّةٍ فى حياتها أمام الرجال.

والفتى فى سريره يتضوّر، يقف ثم يلقي بنفسه، ثم يجلس ثم يطلب الساعة ثم يعالج القيء، وأمّه واجمة، والرجلان يواسيانه وهو يجيبهما: لستُ خيراً من النبيّ. أليس النبيّ قد مات! ويدعو أباه يريد أن يواسيه فلا يجيب الشيخ. وهو يقوم ويقعد ويُلقي نفسه فى السرير مرّةً ومن دون السرير مرّةً أخرى. وصبيّنا منزوٍ فى ناحية من هذه الحجرة، واجم كئيب ذاهل يمزّق الحزن قلبه تمزيقاً.

ثم ألقى الفتى نفسه على السرير وعجز عن الحركة، وأخذ يئنّ أنيناً يخفت من حين إلى حين. وكان صوت هذا الأنين يبعد شيئاً فشيئاً. وإنّ الصبيّ ينسى كلّ شيءٍ قبل أن ينسى هذه الأنة الأخيرة التى أرسلها الفتى نحيلة ضئيلةً طويلةً ثم سكت. فى هذه اللحظة نهضت أم الفتى وقد انتهى صبرها ووهى جلدها، فلم تكد تقف حتى هوت أو كادت، وأسندها الرجلان فتمالكت نفسها وخرجت من الحجرة مطرقةً ساعيةً فى هدوء، حتى إذا جاوزتها انبعث من صدرها شكاة لا يذكرها الصبيّ إلا انخلع لها قلبه

نخلاعاً. واضطرب الفتى قليلاً. ومرّت فى جسمه رعدة تبعها سكوتُ
الموت. وأقبل الرجلان إليه نهيّاه وعصّباه وألقيا على وجهه لثاماً،
يخرجا الى الشيخ. ثم ذكرا أنّ الصبى مُترو فى ناحية من نواحى الحجرة،
نعاد أحدهما إليه فجذبه جذباً وهو ذاهل، حتى انتهى به إلى مكان
بين الناس فوضعه فيه كما يوضع الشئ.

وما هى إلّا ساعة أو بعضُ ساعة حتّى هيّ الفتى للدّفن وخرج
الرجال على أعناقهم.

فيا للقضاء! ما كادوا يبلغون به باب الدار حتى كان أوّل من لقى
النعش هذا العم الشيخ الذى كان الفتى يتمهل الموت دقائق ليراه.

من ذلك اليوم استقرّ الحزن العميق فى هذه الدار، وأصبح إظهار
الابتهاج أو السرور بأىّ حادث من الحوادث شيئاً ينبغى أن يتجنّبه الشبان
والأطفال جميعاً.

من ذلك اليوم تعوّد الشيخ ألّا يجلس الى غدائه ولا إلى عشائه حتّى
يذكر ابنه ويبكيه ساعةً أو بعض ساعة، وأمامه امرأته تعينه على
البكاء، ومن حوله أبناؤه وبناته يحاولون تعزية هذين الأبوين فلا
يبلغون منهما شيئاً، فيجهشون جميعاً بالبكاء.

من ذلك اليوم تعوّدت هذه الأسرةُ أن تعبُر النيل إلى مقرّ الموتى
من حين إلى حين، وكانت من قبل ذلك تعيب الذين يزورون الموتى.

ومن ذلك اليوم تغيّرت نفسيّة صبيّنا تغيّراً تامّاً.. عرف الله حقّاً،
وحرص على أن يتقرّب إليه بكل ألوان التقرّب: بالصّدقة حيناً، وبالصلاة
حيناً آخر، وبتلاوة القرآن مرةً ثالثةً. ولقد شهد الله ما كان يدفعه

إلى ذلك خوف ولا إشفاق ولا إيثار للحياة، ولكنّه كان يعلم أن أخاه الشابّ كان من أبناء المدارس، وكان يقصّر في أداء واجباته الدينية، فكان الصبيّ يأتي من ضروب العبادة يريد أن يحُطّ عن أخيه بعض السيئات وكان أخوه في الثامنة عشرة من عمره، وكان الصبيّ قد سمع من الشيوخ أن الصلاة والصوم فرض على الإنسان متى بلغ الخامسة عشرة. فقدّر الصبيّ في نفسه أنّ أخاه مدين لله بالصوم والصلاة ثلاثة أعوام كاملة وفرض الصبيّ على نفسه ليصلين الخمس في كلّ يوم مرّتين: مرةً لنفسه ومرةً لأخيه، وليصومنّ من السنة شهرين: شهراً لنفسه وشهراً لأخيه وليكتمن ذلك عن أهله جميعاً، وليجعلنّ ذلك عهداً بينه وبين الله خاصّة، وليطعمنّ فقيراً أو يتيماً مما تصل إليه يده من طعام أو فاكهة قبل أن يأخذ بحظّه منه وشهد الله لقد وفى الصبيّ بهذا العهد أشهراً. وما غيّر سيرته هذه إلا حين ذهب إلى الأزهر.

من ذلك اليوم عرف الصبيّ أرق اللّيل؛ فكم أنفق سواد الليل كاملاً يفكّر في أخيه أو يقرأ سورة الإخلاص آلاف المرات، ثم يهب ذلك كله لأخيه، أو ينظم شعراً على نحو هذا الشعر الذي كان يقرؤه في كتب القصص يذكر فيه حُزنه وألمه لفقد أخيه، معنيّاً بألّا يفرُغ من قصيدة حتى يُصلّي في آخرها على النبيّ، واهباً ثواب هذه الصلاة لأخيه.

نعم! ومن ذلك اليوم عرف الصبيُّ الأحلام المروعة؛ فقد كانت علّة أخيه تتمثّل له في كلّ ليلة. واستمرّت الحال كذلك أعواماً. ثم

تقدّمت به السن، وعمل فيه الأزهر عمله، فأخذ علّة أُخيه تتمثّل له من حين إلى حين. وأصبح فتىً ورجلاً، وتقلّبت به أطوار الحياة، وأنه لعلى ما هو عليه من وفاء لهذا الأخ، يذكره ويراه فيما يرى النائم مرةً في الأسبوع على أقلّ تقدير.

ولقد تعزّى عن هذا الفتى إخوته وأخواته، ونسيه من نسيه من أصحابه وأترابه، وأخذت ذكراه لا تزور أباه الشيخ إلا لماماً. ولكنّ اثنين يذكرانه دائماً، وسيذكرانه أبداً أوّل الليل من كلّ يوم: هما أُمّه وهذا الصبيّ۔

اسی طرح اس بچے[۱] (طٰہٰ حسین) کے دن یوں گزرنے لگے کہ کبھی گھر یا مکتب میں ہوتا کبھی محکمۂ قضا یا مسجد میں اور کبھی مفتش کے گھر یا درگاہ ہے علماء کی مجلس اور حلقہ ہائے ذکر میں۔ یہ ایام نہ شیریں تھے نہ کڑوے بلکہ کبھی ان میں مٹھاس ہوتی اور کبھی تلخی آجاتی۔ ان دونوں کی درمیانی حالت میں مزے کی زندگی گزر رہی تھی۔ آخر کار ایک دن ایسا بھی آگیا جبکہ میں نے واقعی رنج و الم کا مزہ چکھ لیا اور اس وقت معلوم ہوا کہ اس سے پہلے کے رنج و غم کی کوئی حقیقت نہ تھی جس سے پہلے دوچار ہوتا رہا اور جس کی وجہ سے میں زندگی سے بھی بیزار ہوگیا تھا۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ زمانہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ لوگوں کو رنج و غم پہنچادے اور اس پر بھی کہ لوگوں کی نگاہوں میں زندگی کو محبوب بنادے اور اسی وقت

---

[۱] طٰہٰ حسین نے اپنی سرگزشت غائب کے صیغے سے لکھی ہے یعنی "میں" کی بجائے "وہ بچہ" "وہ چلا" وغیرہ لکھتا ہے۔ ہم ہر جگہ اس کا ترجمہ متکلم سے کریں گے۔

اس کی اہمیت کو کم بھی کر دے۔

میری ایک بہن تھی جو سارے خاندان میں سب سے چھوٹی تھی۔ ننھی سی جان، بشاش چہرہ، صاف زبان، شیریں کلام اور بڑی سمجھدار، سارے خاندان کا کھلونا تھی۔ تنہائی میں بھی گھنٹوں کھیلا کرتی۔ دیوار کے پاس بیٹھ کر اس طرح دیوار سے باتیں کرتی جس طرح ماں اپنی ملنے والیوں سے کرتی تھی۔ جو کھلونے اس کے سامنے ہوتے اسے وہ کوئی زندہ شخصیت فرض کر کے کھیلتی مثلاً یہ تو آدمی ہے، یہ تو دولہا ہے، یہ دلہن ہے اور یہ بچی۔ ان سب کے پاس باری باری سے آتی جاتی اور ان کے درمیان گفتگو کا رابطہ قائم کرتی۔ کبھی ہنسی مذاق کی باتوں سے اور کبھی بڑے اطمینان و سکون کی گفتگو سے۔ سارا خاندان اس کی ان گفتگوؤں کو سُن کر اور اس کے ان مختلف کھیلوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوتا اور اس بچی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کوئی ان حرکتوں کو بغور دیکھ رہا ہے۔

اسی طرح دن گزر رہے تھے کہ ایک سال عیدالضحیٰ کی چہل پہل کی شروع ہونے لگی۔ میری ماں نے اس عید کی تیاری شروع کر دی، گھر درست کرنے لگی کھانے اور ناشتے تیار کرنے میں لگ گئی۔ میرے بھائی بہن بھی یہ عید منانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بڑے کبھی درزی کے پاس جاتے اور کبھی موچی کی طرف۔ چھوٹے گھر کی اس چہل پہل پر خوش ہو رہے تھے۔ میں اپنے فلسفۂ زندگی کی عادت کے مطابق کبھی ان کو دیکھتا اور کبھی ان کو۔ کیونکہ مجھے نہ درزی کے پاس جانے کی ضرورت تھی نہ موچی کے پاس اور نہ ہی اس قسم کی دوڑ بھاگ کے کھیل سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ میں تو بس تنہائی میں بڑا عالمِ خیال میں کھویا رہتا۔ میں جو قصے کہانی کی یا دوسری کتابیں بڑی زیادتی سے پڑھا کرتا تھا اس کی وجہ سے کھوئے رہنے میں اور بھی مدد ملتی تھی۔

عید کی چہل پہل تو یوں شروع ہوئی اور وہ بچی ایک دن کچھ سست سی ہو گئی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ دیہاتوں اور بعض شہروں کے بچے "عموماً اس طرح کی بے توجہی کا شکار ہوتے ہیں خصوصاً جبکہ افراد خاندان کی تعداد زیادہ ہو اور گھر والی کے سپرد کام زیادہ ہوں۔ اور دیہاتی و شہری عورتوں کا جو فلسفہ ہوتا ہے وہ تو مہمل ہوتا ہی ہے اور ان کی واقفیت (علم) اس سے کم بے ہودہ نہیں ہوتا۔ بچے کو شکایت ہوتی ہے اور ماں اس لئے کوئی توجہ نہیں دیتی کہ شکایت کس بچے کو نہیں ہوتی؟ ایک آدھ دن میں خود ہی ٹھیک ہو جائیگا۔ اور اگر ماں توجہ دیتی بھی ہے تو طبیب کو حقارت سے دیکھتی ہے اور اس سے بے پروائی و تجاہل برتتی ہے اور صرف مہمل علم پر بھروسہ رکھتی ہے یعنی عورتوں کے علم اور ان کے ٹوٹکوں پر۔ اسی چکر میں میں نے اپنی دونوں آنکھیں کھو دیں۔ میری آنکھیں دُکھنے آئیں تو چند دن تو یونہی چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد ایک نائی کو بلایا گیا اور اس نے ایسا علاج کیا کہ آنکھیں ہی جاتی رہیں۔ اسی انداز سے اس بچی نے بھی اپنی زندگی کھو دی۔ وہ روز بروز سُست اور نڈھال ہوتی گئی اور اس کا بخار تیز ہوتا گیا۔ وہ گھر کے ایک کونے میں اپنے بستر پر پڑی رہی۔ کبھی کبھی ماں یا بہن اس کی خبر لے لیتی اور اسے غذا دے دیتی جو خدا جانے ستھری ہوتی تھی یا ردی۔ گھر کی چہل پہل اسی طرح جاری تھی۔ ایک گوشے میں کھانے اور ناشتے تیار ہو رہے تھے اور دوسری طرف دالان اور بیٹھک صاف کی جا رہی تھی۔ بچے اپنے کھیل میں لگے تھے۔ نوجوان اپنے کپڑوں اور جوتوں کی فکر میں تھے۔ بڑے میاں (والد) آتے جاتے اور دن کے آخری حصّے یا رات کے ابتدائی حصّے تک اپنے احباب کی صحبت میں بیٹھتے۔

ابھی چوتھا دن تھا کہ عصر کے وقت یہ تمام چہل پہل یکا یک تھم گئی۔ ماں نے

بھانپ لیا کہ کوئی خوفناک چیز اس گھر کو برباد کرنے والی ہے۔ ابھی تک اس گھر میں موت کو داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور اس نرم دل ماں نے اب تک کسی واقعی صدمے کا مزا نہیں چکھا تھا۔ وہ اپنے کاموں میں مشغول تھی کہ یہ بچی بُری طرح چیخنے لگی۔ ماں اپنے سارے کام چھوڑ کر ادھر لپکی۔ چیخیں مسلسل جاری تھیں بلکہ زیادہ ہوتی جا رہی تھیں۔ اتنے میں بہنیں بھی اپنے سارے مشغلے چھوڑ کر ادھر دوڑ پڑیں۔ چیخیں جاری تھیں اور شدّت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ بچّی اپنی ماں کے دونوں ہاتھوں کے درمیان بل کھا رہی تھی اور بے قرار ہو رہی تھی۔ باپ بھی اپنے احباب کو چھوڑ کر لپکتا ہوا آگیا۔ چیخیں ہنوز شدّت کے ساتھ مسلسل بڑھتی جا رہی تھیں بچّی نے ایک جھرجھری لی ـــــ ناگوار جھرجھری۔ اس کے چہرے پر انقباض طاری ہو گیا اور پسینے چھوٹنے لگے۔ لڑکے اور بڑے سب اپنے کھیلوں اور گفتگوؤں کو چھوڑ کر ادھر آگئے مگر چیخیں تھیں کہ اور بڑھتی جا رہی تھیں۔ سارا خاندان سر جھکائے حیران بچّی کو گھیرے کھڑا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا تدبیر کی جائے؟ اسی حال میں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بڑے میاں کو وہی ضعف کا دورہ ہونے لگا جو ایسے مواقع پر عموماً مردوں کو ہونے لگتا ہے۔ وہ کچھ دعائیں اور کچھ قرآنی آیات بُڑبُڑا کر پڑھنے لگے اور اس کے ذریعے اللہ سے التجائیں کرنے لگے بچّے اور نوجوان رنج و حیرانی کے عالم میں وہاں سے کھسکنے لگے۔ وہ اپنے سابق کھیل یا گپ کو بھول بھی نہیں سکتے تھے اور اسے از سرِ نو شروع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی گھر کے اندر حیران و پریشان تھے

حیران و غمزدہ ماں اپنی بیٹی کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اور کئی قسم کی دوائیں پلا رہی تھی جن کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں کہ کیا دوائیں تھیں۔ چیخیں مسلسل شدّت اختیار کر رہی تھیں اور بے چینی بھی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایسے بچوں میں جو چار سال سے اوپر نہ گئے ہوں اس بچی سے زیادہ قوتِ برداشت ہو سکتی ہے۔ رات کے کھانے کا وقت آگیا اور دسترخوان بچھایا گیا۔ یہ میری سب سے بڑی بہن نے بچھایا تھا۔ بڑے میاں اور ان کے سب بچے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ مگر چونکہ چیخیں مسلسل جاری تھیں اس لئے کسی کا ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھتا تھا۔ یکایک سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور دسترخوان جس طرح بچھایا گیا تھا اسی طرح اُٹھا لیا گیا۔ بچی بے چینی کے ساتھ چیختی جارہی تھی۔ ماں کبھی اسے نظریں جما کر دیکھتی اور کبھی اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتی۔ اس نے اپنا سر بھی کھول لیا حالانکہ یہ اس کی عادت میں داخل نہ تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود آسمان کے دروازے آج بند ہو چکے تھے اور قضا و قدر یقینی ہونے والے فیصلے کی طرف اقدام کر چکی تھی۔ بڑے میاں تلاوتِ قرآن کر سکتے تھے اور غریب ماں گریہ وزاری کر سکتی تھی مگر زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک شخص نے بھی کسی طبیب کی فکر نہ کی۔ رات زیادہ گذر گئی اور بچی کی چیخیں کمزور پڑنے لگیں، آواز دھیمی ہونے لگی اور اس کی بے چینی کم ہونے لگی۔ بے جان ماں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ نے اس کی اور اس کے شوہر کی دعائیں سُن لی ہیں اور تکلیف کی شدت کم ہو گئی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شدت کم ہی ہو رہی تھی اور خدا اس بچی پر مہربان ہو رہا تھا۔ آواز کا دھیما پن اور بے چینی میں سکون اس مہربانی کی علامتیں تھیں۔ ماں اپنی بچی کو دیکھنے لگی اور سمجھی کہ اسے نیند آرہی ہے۔ اس کے بعد پھر دیکھا تو یہ سکون ایسا دائمی تھا جس میں نہ کوئی آواز تھی نہ کوئی حرکت بلکہ ایک بہت خفیف سی سانس تھی جو قدرے کھلے ہوئے ہونٹوں کے درمیان آجا رہی تھی۔ اس کے بعد وہ سانس بھی ختم ہو گئی اور وہ بچی زندگی کو الوداع کہہ چکی تھی۔

اس کی بیماری کیا تھی؟ اس بیماری نے اس کا خاتمہ کس طرح کر دیا؟ یہ باتیں

صرف خدا ہی جانتا ہے۔

اب یہاں دوسری چیخیں بلند ہونے لگیں جو مسلسل تھیں اور زیادہ سے زیادہ شدید ہوتی جا رہی تھیں۔ اور ایک لگاتار بے چینی بھی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی لیکن نہ یہ چیخیں اس بچی کی تھیں نہ یہ بے چینی اس بچی کی تھی۔ یہ چیخیں تھیں اس غریب ماں کی جس نے موت کا مشاہدہ کیا تھا اور یہ بے چینی بھی اسی ماں کی تھی جس نے اپنی بچی کی جدائی کو بُری طرح محسوس کیا۔ نوجوان اور بچے سب دوڑ کر ماں کے پاس آئے اور والدان سب سے پہلے پہنچ گئے۔ وہ ماں ماتم و غم میں مصروف تھی۔ زبان سے بے ربط کلمے نکل رہے تھے۔ آنسو آتے تو آواز میں انقطاع پیدا ہو جاتا۔ وہ مسلسل بُری طرح اپنا منہ پیٹ رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کے سامنے جھکا ہُوا تھا۔ مگر زبان سے ایک حرف بھی نہ نکال رہا تھا۔ پس صرف آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ پڑوسیوں اور پڑوسنوں نے یہ شور سُنا تو تیزی سے آ پہنچے۔ والد باہر مردوں کے پاس گئے تاکہ ان کی تعزیتوں کو حوصلے اور جوانمردی کے ساتھ قبول کریں۔ جوان اور بچے گھر کے مختلف گوشوں میں بکھر گئے۔ جن کے دل مضبوط یا سخت تھے وہ سو گئے اور نرم یا کمزور دل والے جاگتے رہے۔ مگر ماں حسب دستور ماتم کرتی رہی۔ اس کے سامنے اس کی بچی خاموش پڑی تھی اور وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اپنا مُنہ اور سینہ پیٹ رہی تھی۔ اس کے گرد اس کی لڑکیاں اور پڑوستیں بھی اسی طرح گریہ کر رہی تھیں۔ اپنا منہ پیٹ رہی تھیں اور سینہ کوبی کر رہی تھیں، یہاں تک کہ ساری رات اسی میں ختم ہو گئی۔

وہ ساعت بھی کتنی ناخوشگوار تھی جس میں کچھ لوگ آئے اور اس بچی کو اُٹھا کر وہاں لے گئے جہاں سے وہ لوٹ نہ سکے۔ یہ سب کچھ عین عیدِ اضحیٰ کے دن ہُوا۔

گھر کو عید ہی کے لئے ٹھیک ٹھاک کیا گیا تھا۔ اور قربانی کے جانور بھی مہیا کئے جا چکے تھے۔ آہ! وہ دن اور آہ وہ قربانیاں۔ آہ وہ گھڑی جس میں باپ اپنی بچی کو سپردِ خاک کر کے ظہر کے وقت اپنے گھر کو لوٹا۔

اس دن کے بعد اس خاندان اور رنج وغم کے درمیان رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد میرے دادا کا انتقال ہو گیا اور اس کے چند ماہ بعد بوڑھی نانی کی رحلت ہو گئی۔ گویا مسلسل حزن وغم رہا۔ اور ایک مصیبت کے بعد دوسری آتی رہی۔ بعض بڑی سخت اور بعض ہلکی۔ آخر ایک اور منحوس دن بھی آگیا جو اس خاندان نے اب تک نہ دیکھا تھا۔ اس غم نے خاندان کی زندگی پر رنج والم کی ایک دائمی مہر ثبت کر دی اور والدین کے بال اس کی وجہ سے سفید ہو گئے۔ اس غم نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ماں ساری عمر کے لئے سیاہ لباس پہنا کرے گی، اسے کسی خوشی کا مزہ چکھنا نصیب نہ ہو گا، کبھی ایسی ہنسی نہ ہنس سکے گی جس کے بعد ہی وہ رو نہ دے، کبھی آنسو بہائے بغیر سو نہ سکے گی اور جاگنے کے بعد بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہے گی، جب کچھ اچھی غذا کھائے گی تو پہلے محتاجوں اور بچوں کو اس سے کچھ کھلائے گی، عید کے دن بھی نہ ہنسنے پائے گی اور کوئی خوشی کا دن جبر نفس کے بغیر نہ منائے گی۔

یہ ۲۱ راگست ۱۹۰۲ء کا دن تھا اور یہ موسم گرما اس سال کا منحوس ترین موسم تھا مصر میں کالرا پھوٹ پڑا تھا جس نے وہاں کے باشندوں میں بہت جلد ابتری پھیلادی، شہروں اور قریوں کو برباد کر کے رکھ دیا اور خاندان کے خاندان صاف کر دئے۔ ہمارے گاؤں کے میاں جی کثرت سے تعویذ گنڈے کیا کرتے تھے۔ مدارس اور مکاتب سب بند ہو گئے۔ ان کے سامان اور خیمے تھے جن کے اندر وہ مریضوں کو گھسنے نہ دیتے تھے۔ لوگوں میں خوف وہراس پھیلا

ہُوا تھا اور دلوں میں اپنا گھر کئے ہوئے تھا۔ لوگوں کے لئے زندگی ناقابلِ اعتماد ہوگئی تھی۔ ایک گھرانہ کسی دوسرے گھرانے کا ذکر اس طرح کرتا کہ گویا وہ اپنے حصے کی آفت کا انتظار کر رہا ہے۔ میری ماں تو لگاتار خوف و ہراس میں مبتلا تھی اور روز ہزار بار اپنے دل میں کہتی کہ دیکھئے اب اس کے بیٹوں اور بیٹیوں میں سے کس پر آفت نازل ہوتی ہے۔ اس کا ایک اٹھارہ سال کا فرزند تھا جو خوش شریف اور ذہین تھا۔ یہ اپنے خاندان بھر میں سب سے زیادہ سمجھدار، شریف نرم خو، صاف دل تھا اور باپ کا سب سے زیادہ فرمانبردار اور ماں کا سب سے بڑھ کر چاہنے والا تھا۔ اپنے تمام چھوٹے بھائیوں بہنوں پر سب سے زیادہ مہربان تھا۔ ہمیشہ خوش رہتا۔ اسے "بکالوریا" کی سند ملی تھی اور طبی مدرسے میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ اس گرمی کے آخر میں قاہرہ جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ جب وبا پھوٹی تو وہ طبیبِ شہر کے پاس چلا گیا اور اسی کے ساتھ یہ کہہ کر رہنے لگا وہ بھی پریکٹس کرے گا۔ آخر ۲۱ اگست کی تاریخ آ گئی۔

اس دن شام کو یہ نوجوان حسبِ عادت مُسکراتا ہُوا آیا۔ اپنی ماں سے بڑ محبت سے پیش آیا۔ کچھ دل بہلانے والی باتیں کرکے اس کی دہشت کو کم کیا ا کہا کہ آج تو شہر میں بیس سے زیادہ موتیں نہیں ہوئی ہیں اور اب وبا کا زور ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود اسے کچھ متلی سی محسوس ہوتی رہتی تھی۔ وہ اپنے باپ پاس جاکر بیٹھ گیا اور حسبِ معمول باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ اپنے دوستوں کے پا گیا اور ان کو ساتھ لے کر ہر روز کے معمول کی طرح "شاطئ ابراہیمیہ" کی طرف شروع رات میں واپس آیا اور اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ ہنسی خوشی کچھ وقت اس رات کو اس نے یہ سوچا کہ کالرے سے بچنے کے لئے تمام گھر والوں کو لہسن استعم کرنا چاہیئے۔ ———— اس نے خود بھی لہسن کھا

اپنے سب چھوٹے بڑے بھائی بہنوں کو بھی کھلایا۔ اپنے والدین کو بھی یہ بات سمجھانی چاہی۔ مگر وہ ان کو اس پر مطمئن نہ کر سکا۔

تقریباً نصف شب گزر چکی تھی اور گھر کے تمام بڑے چھوٹے حتیٰ کہ جانور بھی مزے کی گہری نیند سو رہے تھے کہ دفعتہً ایک عجیب قسم کی آواز سے یہ پُر سکون فضا معمور ہو گئی اور سب کے سب چونک اُٹھے۔ میرے والدین جو اندر ایک کھلے برآمدے میں آسمانی چھت کے سائے میں تھے اپنے فرزند کا نام لے کر پکارنے لگے۔ گھر کے نوجوان اپنے بستروں سے اچھل کر اس آواز کی طرف لپکے اور بچے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنی آنکھیں ملتے ہوئے ذرا خوف زدہ ہو کر بار بار دریافت کرنے لگے کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے اور یہ کیا قصّہ ہے؟

ان تمام باتوں کا سبب اس نوجوان کی وہ آواز تھی جو قے کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس نوجوان نے ابتدائی ایک دو گھنٹے تو یوں گزارے کہ اپنے پنجوں کے بل اپنے کمرے سے باہر جاتا رہا کہ الگ چپکے سے قے کر لے اور کسی کو جگانے کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن جب تکلیفِ مرض اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اپنے اوپر اتنا قابو نہ رکھ سکا، کہ آسانی سے قے کرے۔ آخر والدین نے یہ قے کی آواز سن لی اور کلیجہ دھک سے ہو گیا اور ان کے ساتھ تمام گھر کے لوگ بھی گھبرا گئے۔

اس نوجوان پر آفت نازل ہوئی اور وبا نے اس گھر کا بھی راستہ دیکھ لیا۔ ماں کو بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے کس فرزند پر مصیبت نازل ہو رہی ہے۔ اس رات کو باپ کی جو کیفیت تھی وہ فی الواقع حیرت افزا تھی۔ وہ خوفزدہ ہونے کے باوجود پُرسکون اور پُر وقار تھا اور اپنے اوپر قابو رکھے ہوئے تھا۔ اس کی آواز سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل پھٹا جاتا ہے اور ساتھ ہی دوسری طرف یہ نظر آتا تھا کہ وہ بلند حوصلہ ہے اور آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ اپنے اس فرزند کو

اپنے کمرے میں لے آیا اور حکم دیدیا کہ اس کے بھائی بہن اس کے آس پاس نہ آئیں۔ پھر تیزی سے باہر گیا اور اپنے دو پڑوسیوں کو آواز دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک طبیب کو ساتھ لے کر واپس آگیا۔

اس دوران میں ماں سہمی اور گھبرائی ہوئی حوصلے کے ساتھ اپنے فرزند کی طرف متوجہ تھی۔ جب قے سے ذرا مہلت ملتی تو وہ باہر صحن میں نکل آتی اور اپنے ہاتھ اور چہرے کو آسمان کی طرف اُٹھا کر دعا اور فریاد میں محو ہو جاتی۔ اور جوں ہی قے کی آواز سنتی تو دوڑی ہوئی آتی اور اپنے سینے کے سہارے اسے بٹھاتی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر تھام لیتی اور اس وقت بھی دعا و زاری کے الفاظ اس کی زبان پر جاری رہتے۔

وہ بچوں اور جوانوں کو مریض سے الگ رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی، نتیجہ یہ کہ سب کے سب اس کے کمرے میں اس کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ اس کو جب بھی قے سے مہلت ملتی تو وہ اپنی ماں سے زندہ دلی کی باتیں کرتا اور اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے ہلسی مذاق بھی کر لیتا۔ آخر طبیب آیا اور نسخہ لکھا، ضروری ہدایات دیں اور صبح پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ماں تو اسی کمرے میں بیٹے کے پاس جمی رہی اور باپ اسی کمرے کے پاس ہی گم سم بیٹھا تھا۔ وہ نہ دعا کر رہا تھا نہ نفلیں پڑھ رہا تھا۔ جو لوگ اس سے باتیں کرتے ان کا جواب بھی نہ دیتا۔

دیر کے بعد صبح ہوئی اور اس نوجوان کی پنڈلیوں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ بہنوں نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں دبانے شروع کر دئے۔ کبھی تو وہ اپنی تکلیف کو دباتا ہوا کراہتا اور کبھی قے اس کا بُرا حال کر دیتی اور اسی آن والدین کے کلیجے منہ کو آ جاتے۔ سارے خاندان کی یہ صبح ایسی گزری جو اس سے پہلے کبھی نہ گزری تھی۔ صبح سناٹی اور تاریک صبح تھی جس میں کوئی شے بار بار ڈرا رہی تھی۔ باہر مردوں

ہجوم تھا جو باپ سے ہمدردی کر رہا تھا اور اندر عورتوں کا اژدھام تھا جو ماں کو ڈھارس دے رہا تھا۔ ماں وہاں اور باپ یہاں لوگوں سے بے خبر تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد طبیب آ آ کر دیکھتا مریض نوجوان نے خواہش کی کہ قاہرہ میں اس کے ازہری بھائی کو اور فلاں جگہ اس کے چچا کو تار دے دیا جائے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گھڑی مانگ کر اس طرح دیکھتا جیسے وہ وقت کو بہت جلدی گزرتا ہوا دیکھ رہا ہے اور ڈر رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے جوان بھائی اور بوڑھے چچا کو دیکھے بغیر ہی وہ چل بسے۔ آہ ۲۱ راگست ۱۹۰۲ء کی وہ منحوس گھڑی۔ تین بجے کا وقت۔

طبیب مایوس ہو کر کمرے سے باہر آ گیا۔ شاید اس نے باپ کے دو خاص ترین ساتھیوں کے کان میں کہہ دیا کہ اب اس نوجوان کا وقت اخیر ہے۔ یہ دونوں اس نوجوان کے پاس کمرے میں گئے۔ ماں اپنے فرزند کے پاس بیٹھی تھی۔ جو آج اپنی عمر میں پہلی بار مردوں کے سامنے ہوئی۔

نوجوان ٹیک لگائے کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ بیٹھتا اور پھر اپنے آپ کو تکیئے پر گرا دیتا۔ پھر بیٹھ جاتا اور گھڑی مانگتا۔ پھر قے کرتا۔ ماں سکتہ دم ہو رہی تھی۔ وہ دونوں آدمی نوجوان کو تسلی دے رہے تھے اور وہ یوں جواب دے رہا تھا کہ: میں نبی کریم سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ کیا خود حضورؐ کو موت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ نوجوان نے اپنے باپ کو بلا کر بھی دلاسا دیا مگر باپ کچھ بول نہ سکا۔ مریض اٹھ بیٹھتا اور کبھی تکیئے پر اور کبھی اس سے ہٹ کر اپنے آپ کو ڈال دیتا۔ میں (طہٰ حسین) اس کمرے کے ایک کونے میں سمٹا، سکتہ دم، غمگین، خوف زدہ بیٹھا تھا۔ صدمے سے کلیجے کے ٹکڑے اڑے جا رہے تھے۔

نوجوان نے اپنے آپ کو تکیئے پر ڈال دیا اور کوئی جنبش کرنے سے بھی قاصر ہو گیا۔ وہ کانپنے لگا جس کی آواز کمزور ہوتی گئی۔ کانپنے کراہنے کا وقفہ بھی دراز ہوتا گیا۔

میں ہر چیز کو فراموش کر گیا۔ صرف اس کا وہ آخری بار کا نکھنا یاد ہے جو کمزور نحیف اور طویل ہی تھا جس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

ماں اسی وقت اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ اس کا صبر ختم ہو چکا تھا اور قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ ذرا کھڑی ہوئی تھی کہ اُلٹ کر گرنے لگی۔ اور ان ہی دو آدمیوں نے اسے سہارا دے دیا۔ اس وقت اسے کچھ ہوش آیا اور وہ سر جھکائے اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ کمرے سے باہر آکر اس کے سینے سے جو نالہ و فریاد کی آواز نکلی وہ ایسی تھی کہ آج تک جب مجھے وہ یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ نوجوان نے اپنے سکوت کے بعد ذرا سی جنبش کی اور جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی جو موت کی جھرجھری تھی۔ ان دونوں آدمیوں نے اسے ٹھیک سے لٹا دیا اور منہ پر کپڑا ڈال دیا پھر اس کے باپ کے پاس چلے گئے۔ اسے خیال آیا کہ میں (طہٰ حسین) کمرے کے ایک گوشے میں سمٹا بیٹھا ہوں۔ ان میں سے ایک شخص لوٹ کر آیا اور مجھے اپنی طرف کھینچ اٹھایا میں اس وقت نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر مجمع میں آیا اور مجھے ایک جگہ اس طرح بٹھا دیا جیسے کوئی چیز رکھ دی جاتی ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نوجوان کو دفن کرنے کا سامان کیا گیا اور لوگ اپنے کاندھوں پر اسے لے کر چلے گئے۔

آہ قضا و قدر کی کارفرمائیاں! لوگ جنازہ لے کر گھر کے دروازے تک پہنچے کہ سامنے ہی مرحوم کا وہ بوڑھا چچا ملا جسے دیکھنے کے لئے یہ نوجوان موت سے چند منٹ مہلت مانگ رہا تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جو دروازے پر اس کے جنازے سے ملا۔

اس دن کے بعد سے اس گھرانے میں اس شدید صدمے کا اثر ہمیشہ کے لئے رہ گیا اور خوشی کا ہر موقع کچھ ایسا ہو گیا کہ تمام خرد و کلاں کو اظہارِ مسرت سے پرہیز کرنا مناسب معلوم ہونے لگا۔

اس دن سے باپ کا یہ معمول ہو گیا کہ جب وہ صبح یا شام دسترخوان پر بیٹھتا تو پہلے اپنے اس فرزند کو یاد کر کے کچھ دیر رو لیتا اور سامنے بیٹھی ماں اس کے لئے اور باعثِ گریہ بن جاتی۔ اس کے گرد اس کے لڑکیاں لڑکے ہوتے جو اپنے والدین کی غمگساری کرتے مگر جب نتیجہ کچھ نہ نکلتا تو ان سب کی بھی رونی صورت بن جاتی۔

اسی دن سے افرادِ خاندان کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ کبھی کبھی دریائے نیل کو عبور کر کے قبرستان میں جاتے حالانکہ اس سے پہلے وہ زیارت قبور کو معیوب سمجھتے تھے۔

اس دن سے میرے اندر ایک مکمل نفسیاتی انقلاب آگیا مجھے تو خدا نظر آگیا میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ قربِ الٰہی حاصل کرنے کی جتنی شکلیں ممکن ہیں وہ سب میں اختیار کروں گا۔ کبھی صدقہ دوں گا، کبھی نمازیں ادا کروں گا اور کبھی تلاوتِ قرآن کروں گا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے یہ فیصلہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے کوئی موت کا ڈر تھا یا اپنی زندگی پیاری تھی بلکہ مجھے یہ معلوم تھا کہ میرا نوجوان بھائی طالب علم تھا اور وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی بھی کر جاتا تھا اس لئے میں جو کچھ مختلف قسم کی عبادتیں کرنا چاہتا تھا اس کا مقصد فقط یہ تھا کہ میں اپنے مرحوم بھائی کے بعض گناہوں کو دھو سکوں۔ میرے بھائی نے اٹھارہ سال کی عمر پائی تھی اور میں نے بزرگوں سے یہ سن رکھا تھا کہ انسان جب پندرہ سال کا ہو جاتا ہے تو اس پر نماز روزہ فرض ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے اندازہ لگا لیا کہ میرا بھائی پورے تین سال کے نماز روزے کا عنداللہ قرضدار ہے۔ اس لئے میں نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا کہ میں نماز پنجگانہ ہر روز دو بار پڑھا کروں گا۔ ایک بار اپنی طرف سے اور ایک بار مرحوم بھائی کی طرف سے۔ اور روزے بھی سال میں دو ماہ کے رکھا کروں گا۔ ایک مہینہ اپنی طرف سے اور ایک اس کی طرف سے۔ اور اس معاملے کو اپنے اور خدا کے درمیان ایک خاص عہد تصوّر کروں گا۔ میں نے یہ بھی طے کر لیا کہ میرے ہاتھ میں جو بھی کھانا یا پھل آئے گا اس میں اپنا حق لینے سے پہلے کسی محتاج یا یتیم کو کچھ کھلا دیا کروں گا۔

خدا گواہ ہے کہ میں کئی مہینے تک یہ عہد پورا کرتا رہا اور اس معمول میں اس وقت فرق آیا جب میں ازہر گیا۔

اس دن سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ نیند کا اچاٹ ہو جانا کیا ہوتا ہے؟ اس لئے کہ بعض اوقات ساری ساری رات اس طرح گزری ہے کہ میں بھائی کو یاد کرتا اور ہزاروں بار سورۂ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب اپنے مرحوم بھائی کو بخشتا۔ یا پھر کوئی ایسا شعر موزوں کرتا جیسا کہ میں قصے کی کتابوں میں پڑھا کرتا تھا جس میں شاعر اپنے بھائی کے مرنے کا ماتم و غم کرتا ہے، اور ساتھ ہی یہ خیال رکھتا کہ جب بھی کوئی ایسا قصیدہ پڑھوں گا تو آخر میں نبی کریم پر صلوٰۃ وسلام عرض کر کے اس کا ثواب اپنے بھائی کو پہنچا دوں گا۔

اور ہاں اسی دن سے مجھے ڈراؤنے خوابوں کا بھی تجربہ ہونے لگا کیونکہ ہر رات میرے بھائی کی بیماری متشکل ہو کر میرے سامنے آجاتی اور برسوں یہی ہوتا رہا۔ پھر جب میری عمر کچھ زیادہ ہوئی اور ازہر نے بھی مجھ پر اپنا اثر کیا تو میرے بھائی کی بیماری کبھی کبھی ہی میرے سامنے متشکل ہو کر آتی میں جوان اور پھر اور بڑا ہوا اور زندگی کے مشاغل نے مختلف انداز اختیار کر لئے مگر آج بھی اس بھائی کے ساتھ میری وفاداریاں اسی طرح قائم ہیں۔ میں اسے یاد رکھتا ہوں اور اسے کم از کم ہر ہفتے تو ضرور خواب میں دیکھ لیتا ہوں۔

میرے بھائی بہن تو اس مرحوم کے ماتم کو بھول چکے ہیں اور اس کے ساتھی اور ہم سن بھی فراموش کر چکے ہیں۔ بوڑھے باپ کو بھی اس کی یاد معمولی طریقے پر آتی ہے۔ مگر صرف دو ہستیاں ہیں جو اسے ہمیشہ یاد کرتی رہتی ہیں اور ہمیشہ ہر آغاز شب میں اسے یاد کرتی رہیں گی۔ ایک ماں اور دوسرے میں۔

وعد اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم
فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم
الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی
لا یشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذالک فاولٰئک ھم الفاسقون۔
تم میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیۓ ان سے اللّٰہ کا وعدہ ہے
کہ وہ انہیں اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے
لوگوں کو خلیفہ بنایا اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اسے متمکن کردیگا
اور ان کے خوف کے بعد اس طرح ان کو امن سے بدل دے گا کہ وہ کسی
چیز کو میرا شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد بھی کفر کرے تو پھر ایسے لوگ
فاسق ہونگے۔

(۱)

عامر کے بیٹے یاسر نے اپنے دونوں بھائیوں مالک اور حارث سے کہا:
تم دونوں چاہو تو یمن واپس چلے جاؤ۔ یا چاہو تو اس وسیع زمین کی یونہی خاک
چھانتے پھرو۔ میں تو اب یہیں رہوں گا۔ مجھے یہ سرزمین ایسی بھا گئی ہے کہ اب
میں کسی دوسری سرزمین کو اس کے برابر نہیں سمجھ سکتا۔ میں اس جگہ سے خوش
ہوں اور اس کا کوئی بدل نہیں چاہتا جس زمین میں میں نے خوف کے بعد امن، ضعف
کے بعد قوت اور تنگی کے بعد فراخی پائی ہے اس سے مُنہ موڑ کر تو کہیں نہ جاؤنگا۔"

یاسر کے بھائی مالک بولے: یوں کیوں نہیں کہتے کہ میں اس جگہ سے نہیں ٹلوں گا جہاں یہ سیاہ فام لونڈی موجود ہے۔ جس پر تمہارا تو کچھ اختیار نہیں مگر وہ تمہاری ہر چیز کی مالک بن گئی ہے۔

یاسر نے کہا: جو دل چاہے گمان کرو لیکن اب میں یہیں رہوں گا۔ نہ اس سرزمین سے ٹلوں گا نہ اس گھر کو چھوڑوں گا۔

دوسرے بھائی (حارث) بولے: خدا کی مار ہو تم جیسے نوجوانوں پر جو وطن پر غربت کو، قحطان پر مُضَر کو، اور عنس پر قریش کو ترجیح دیتے ہیں۔ تمہارا ناس ہو جائے گا۔ تم ذلت سے اور ناگواریوں کے بوجھ سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہاں کسی سے مدد چاہو گے تو مدد نہیں ملے گی۔ مددگاروں کو پکارو گے تو جواب دینے والے صرف وہی لوگ ہوں گے جو تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہاں والے تمہارے خلاف دوسروں ہی کی مدد کریں گے۔

مالک نے کہا: تمہاری یہ کالی کلوٹی لونڈی نہ مکّے کی زمین سے اُگی ہے نہ مکّے کے آسمان سے ٹپکی ہے نہ اس کے اندر کسی عام لونڈی سے زیادہ کوئی کشش ہے۔ تم اگر چاہو تو ایسی لونڈیاں تمہیں ہر جگہ مل سکتی ہیں۔ تاہم اگر تم پسند کرو تو ہم کسی حیلے بہانے اسے یہاں سے اڑا بھی لے جا سکتے ہیں۔ پھر تم اطمینان سے اپنے بھائیوں اور دوستوں میں اس کے ساتھ رہنا۔

یاسر نے جواب دیا: تم دونوں اپنے لئے جو مناسب سمجھو کرو میں تو یہیں رہوں گا۔ نہ اس سرزمین کو چھوڑوں گا نہ اس گھر سے مُنہ موڑوں گا۔ اور ابو حذیفہ کی نیکی کا بدلہ کسی بُرائی سے ہرگز نہ دوں گا۔ جس شخص نے مجھے ٹھکانا دیا، مہمان نوازی کا ایسا حق ادا کیا، اس کی نیکی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دے سکتا اور نہ اسے کوئی مالی نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ تم خواہ یمن کو لوٹ جاؤ یا اس وسیع زمین

کی خاک چھانتے پھرو، میں تو اب یہیں مقیم رہوں گا۔ میں تو اس گھر کے اندر اپنے لئے ایک عجیب سی کشش پاتا ہوں۔

حارث بولے: غلام کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اسے غلامی سے کوئی نفرت نہیں ہوتی۔ وہ غلامی کی طرف لپکتا ہے اور اس میں مگن رہتا ہے۔ یہ لوگ اگر تم پر مہربانی کریں اور مال و دولت میں پیش پیش رکھیں جب بھی تم جیسے حلیف کی پوزیشن یہ ہوگی کہ تم ان کے محتاج رہو گے مگر وہ تمہارے محتاج نہ ہونگے۔

یاسر نے جواب دیا: بھئی تم دونوں چاہو تو واپس جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔

حارث نے اپنے بھائی مالک کی طرف مڑ کر کہا: چھوڑو بھی اس منحوس کو اس سے تو بھلائی کی توقع ہی فضول ہے۔

اور دوسرے دن صبح صبح یہ دونوں نوجوان (حارث و مالک) مکّے سے اپنی سواری دوڑاتے ہوئے نکل گئے۔ یہ سواری (اونٹ) ان دونوں کو ابو حذیفہ بن مغیرہ نے دی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ یاسر بھی نکلے تھے، لیکن بقصد سفر نہیں بلکہ صرف رخصت کرنے کے لئے۔

یہ تینوں بھائی (یاسر، مالک اور حارث) دراصل اپنے وطن (تہامۂ یمن) سے اس لئے نکلے تھے کہ ان کا ایک بھائی کھو گیا تھا جسے یہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ جہاں یہ جاسکے گئے اور جتنی تلاش کر سکتے تھے کی۔ جب نا اُمید ہو گئے تو اپنے وطن کو واپس ہوئے۔ اور اس واپسی میں وہ مکّے سے بھی گذرے۔ چونکہ غیر معمولی دوڑ دھوپ اور طویل سفر نے انہیں تھکا دیا تھا اس لئے انہوں نے یہ طے کیا کہ چلو اس بستی کو بھی دیکھ لیں۔ بیت اللہ کے پاس اُتر کر خداؤں، (دیوتاؤں اور بتوں) سے التجائیں کریں اور کچھ آرام بھی کرلیں بلکہ وہاں کے لوگوں سے شاید تلاش کی کوئی اور سبیل بھی معلوم ہو۔

یہ تینوں بھائی مکے میں ٹھہر گئے۔ طواف کعبہ کیا اور خداؤں سے دعا کی مگر وہاں انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ پھر وہ بیت اللہ میں ٹھہر کر انتظار کرتے رہے کہ صبح قریش اپنے جتھوں اور ٹولیوں میں کب آتے ہیں۔ چاشت کا وقت آیا تو ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی ان کے پاس سے گذرے۔ اور ان کی مسافرانہ پریشانی دیکھی تو قریشی رواج کے مطابق انہیں اپنے ساتھ لے آئے اور بڑی خاطر مدارات کی۔

ابو حذیفہ نے اپنے ان مہمانوں کی خدمت ایک سیاہ فام لونڈی کے سپرد کردی تھی جس کا نام سُمیہ بنت خیاط تھا۔ اُٹھتی ہوئی جوانی۔ جمال میں عجیب سی دلکشی اور تازگی۔ شباب کا شرمیلا پن۔ ایک ناز اور رنگینی۔ زبان میں ایسی حسین گھلاوٹ اور مٹھاس کہ کانوں کو بھلی لگے اور دلوں کو متاثر کردے۔

یہ لونڈی دن چڑھے اور رات گئے ان مہمانوں کو کھانا کھلاتی اور خدمت میں رہتی۔ خود باتیں کرتی اور ان کی باتیں سُنتی۔ اور یوں وہ اس نوجوان (یاسر) کے دل میں اُتر گئی۔ اور اسے مکے میں رہنے پر مجبور کردیا۔ اور کون جانتا ہے کہ یاسر نے دورانِ گفتگو میں اس کی بابت بھی وہی کچھ محسوس کیا ہو جو خود اپنے متعلق محسوس کیا تھا یعنی ایک پراگندہ حال پردیسی کا قدرتی میلان ایک پراگندہ حال پردیسی کی طرف۔

نوجوان یاسر نے ارادہ تو یہی کیا تھا کہ دل پر جبر کرکے اپنے بھائیوں کے ساتھ وہاں چلا جائے جہاں ایک بوڑھا غمگین باپ اور ایک بوڑھی دل گرفتہ ماں دونوں انتظار کر رہے ہوں گے۔ لیکن اب وہ اپنا یہ ارادہ پورا کرنے پر قادر نہ تھا۔ انسان کی زندگی اس کے ارادوں کی پابند نہیں نہ زندگی کسی کے اندازوں کے مطابق چلتی ہے۔ یہ تو وہ سربستہ معاملات ہیں جن پر قضا و قدر ہی کے فیصلے نافذ ہوتے ہیں اور قضا و قدر اپنے فیصلوں میں کسی سے مشورہ نہیں طلب کیا کرتی۔

معاملات انسانی زندگی میں کچھ ایسے نتائج پیدا کر دیتے ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہؤا کرتا۔

آج جس حقیقت میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں وہ یہ ہے کہ جن دونوں بھائیوں (مالک و حارث) نے اپنی سواری بڑھائی اور مکے سے تہامہ (یمن) کی طرف نکل گئے وہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے بے نام و نشان ہو گئے۔ ان کے متعلق اب کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ یہ دونوں ایسے ہی گمنام ہیں جیسے ان کا گمشدہ بھائی یا ان کے والدین۔ لیکن یہ نوجوان یاسرؓ اپنے دونوں بھائیوں کو مکّے سے رخصت کرنے کے بعد مکّے میں پہلے تو ابو حذیفہ کے مہمان کی حیثیت سے مقیم رہا۔ اس کے بعد ابو حذیفہ کا حلیف بھی ہؤا پھر جب اس سیاہ فام لونڈی سُمیّہ کا شوہر ہؤا تو جبھی سے دنیا نے اس کو جانا بھی اور تاریخ نے اس کا نام اپنے سینے میں محفوظ بھی کر لیا۔

(۲)

ہوا یوں کہ ایک دن ابو حذیفہ اپنی محفل سے واپس ہوتے ہوئے اپنے گھر کو لوٹ رہے تھے کہ بیت اللہ کے قریب ہی یاسر سے ملاقات ہوئی۔ ابو حذیفہ نے مسکرا کر پوچھا:

کہو نوجوان! تمہارے ان دونوں بھائیوں کا کیا فیصلہ رہا۔

یاسر: وطن کے قرب کو انہوں نے وطن کی دوری پر ترجیح دی اور اپنی قوم میں لوٹ کر چلے گئے۔

"اور تم نے مکّے میں رہ کر وطن کی دوری کو اس کے قُرب پر ترجیح دی؟"

"نہیں، بلکہ اس پُر امن حرم کو دوسرے مقاماتِ خوف پر ترجیح دی۔ یمن میں جو گمراہی اور بے راہ روی ہے اس پر میں نے اس بیتِ عتیق کے جوار کو ترجیح دی"

"تم مکّے میں رہ کر کیا شغل رکھو گے؟"

"کوئی روزگار تلاش کروں گا۔"

"اچھا تو جب تک تم میرے پڑوسی ہو تمہیں فکرِ معاش کی کوئی ضرورت نہیں"

"قربانت شوم۔ تم تو واقعۃً ایسے سردار ہو جو بنی مخزوم کے لئے باعثِ فخر، قریش کے لئے نشانِ امتیاز، اور سرزمینِ بطحا کے لئے باعثِ عزت ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے تم دل کے سخی اور سیرت کے پسندیدہ ہو۔ ہر چیز کی حفاظت کرتے ہو۔ بھوکے کو کھانا کھلاتے ہو۔ سائل کا سوال پورا کرتے ہو۔ اور محتاج کو غنی کر دیتے ہو۔ پڑوسی کی حمایت اور مصیبت زدہ کی دادرسی کرتے ہو۔"

"بس کرو صاحبزادے! تم نے تو بہت کچھ مبالغہ کر لیا۔ تمہارے اندر ذہانت

ور طاقت دونوں موجود ہیں۔ پس تم جب تک اس بستی میں ہو میری حمایت میں ہو گے۔"

"تمہارے سوا تو اور میں کسی کو جانتا بھی نہیں لیکن میں تمہیں ایک ایسی سطح پر لانا چاہتا ہوں جو میرے تمہارے درمیان مساوی ہو جو نہ تم پر بار ہو نہ میرے لئے ہلکی یعنی جن مواقع پر تم اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حمایت کیا کرتے ہو ان ہی مواقع پر میری بھی حمایت کرنا۔ اور میں یہ کروں گا کہ جس سے تمہاری جنگ ہو اس سے میری بھی جنگ جس سے تمہاری صلح ہو میری بھی صلح۔ میں اپنے امکان بھر تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے لئے تمام دشمنوں کے مقابلے میں سپر بنا رہوں گا۔"

"پھر تو یہ ایک حلف ہوا نا؟ ایک دوسرے کا حلیف بننا۔ باہمی تعاون کا عہد و پیمان۔"

"ہاں اگر تم اسے پسند کرو۔"

"مجھے منظور ہے اور اعتماد بھی ہے۔ کل بیت اللہ میں چل کر اس قول و قرار کو پکا کرنے کا وعدہ رہا۔"

"مگر تم مسجد سے کچھ دور تو ہو تو ہو نہیں۔ اور ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ جس کام کو آج کر سکتے ہوں اسے کل پر ٹالیں۔"

"اچھا تو چلو۔"

اس گفتگو کے بعد ابو خذیفہ اس نوجوان (یاسر) کا ہاتھ پکڑ کر اُلٹے پاؤں چند قدم گئے جب بیت اللہ میں پہنچے تو کعبے کے اندر جانے کا ارادہ کیا۔ نوجوان نے پوچھا:

"کدھر چلے؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ اپنے حلف پر دیوتاؤں کو گواہ بنالیں۔"

"یہ خدایانِ کرام تو یہیں ہیں کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے اپنی قوم کو گواہ بناؤ۔ اس سے قبل کہ وہ اپنی مجلسوں کو برخواست کر کے منتشر ہو جائیں۔

"بھئی آج سے پہلے تو میں نے کبھی ایسا ذہین اور حاضر دماغ نوجوان نہیں دیکھا تھا۔"

اس گفتگو کے بعد ابو حذیفہ یاسر کو لے کر قریش کے مختلف مجمعوں کی طرف گئے اور ہر مجمعے کے پاس سے گزرتے ہوئے یہ اعلان بھی کرتے گئے کہ: اے قریشیو! گواہ رہنا کہ میں نے اس عنسی نوجوان یاسر بن عامر کو اپنا حلیف بنا لیا ہے۔" ابو حذیفہ نے قریش کے جس مجمعے سے گزرتے ہوئے یہ اعلان کیا وہیں سے لوگوں نے پکارا کہ تم نے کچھ بُرا نہیں کیا۔ یہ مُحالفت[1] مبارک۔

قریش کی تمام مجالس کا "چکر" لگانے کے بعد ابو حذیفہ یاسر کو لے کر کعبے کی طرف چلے تو یاسر نے پوچھا:

"کدھر کا ارادہ ہے؟"

"اب اپنے خداؤں کو اپنے حلف کا گواہ بنانا ہے۔"

(ہنس کر) "واہ میاں ابو حذیفہ واہ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگوں کو جب تم گواہ بنا رہے تھے تو یہ خدا سُن نہیں رہے تھے۔ بھئی وہ سُن بھی چکے۔ گواہ بھی ہو چکے اور خوش بھی ہو لئے۔ انسان جب کسی دوسرے انسان سے سرگوشی کرنا چاہتا ہے تو اس کے قریب ہو جاتا ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ان خداؤں سے بھی جب تک اسی طرح آدمی قریب نہ ہو اس وقت تک یہ سُن ہی نہیں سکتے۔"

"مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں نے کسی شیطان کو حلیف بنا لیا

---

[1] ایک دوسرے کا حلیف بننا۔

"ارے بھئی، ہم لوگوں کا یہ دستور رہا ہے کہ خداؤں سے بات کہتے وقت اس طرح ان کے قریب ہو جاتے ہیں جس طرح سرگوشی کے وقت آدمی سے آدمی قریب ہو جاتا ہے۔"

"تو ان خداؤں سے قریب ہونے کے لئے تم جہاں بھی چاہو کھڑے ہو کر قریب ہو سکتے ہو کیونکہ ہر مقام پر وہ بہر حال تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

ابو حذیفہ کو کچھ لاجوابی اور کچھ تلملاہٹ کی مخلوط سی کیفیت نے تھوڑی دیر کے لئے خاموش کر دیا۔ پھر جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز تھی جو اسے مل گئی یا وہ خود کھویا ہوا تھا اور ہوش میں آ گیا اور بولا:

"بھئی اس حلف کے احترام و تقدیس کا حق تو اس وقت پورا ہو گا جب ہم طوافِ کعبہ بھی کر لیں گے۔"

"ہاں اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس کے بعد یہ دونوں بڑھے چلے اور طواف کعبہ کرتے رہے۔ پھر یہ دونوں حلیف گھر کو لوٹ آئے۔ عموماً دو حلیفوں کے درمیان جو رابطہ ہوتا ہے یہاں اس سے کچھ ماسوا بھی تھا۔

ابو حذیفہ نے گھر واپس آتے وقت راستے میں کہا:

"عنسی جوان (یاسر)! مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے اندر ہمارے خداؤں کے متعلق کچھ بے حرمتی اور انحراف کا جذبہ موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم بنی عنس کے خداؤں کو ابھی تک بھولے نہیں ہو اور یہ چاہتے ہی نہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے خداؤں کی طرف سے تمہارا دل صاف رہے۔"

"قربانت شوم۔ بخدا اے ابو حذیفہ! اصل بات تو یہ ہے کہ عنس کے خداؤں کو ہم نے کبھی یاد ہی نہیں کیا جو ان کو فراموش کرنے یا نہ کرنے کا کوئی سوال

پیدا ہو مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان خداؤں کے پاس صبح یا شام کو حاضری دی ہو یا ان کی کسی قدرت کو تسلیم بھی کیا ہو۔"

"تو کیا تم صابی ہو گئے ہو یا اپنے خداؤں سے پھر کر یہود و نصاریٰ کے خداؤں کو قبول کر لیا ہے؟"

"ملا تو ہوں میں ان سبھوں سے اور باتیں بھی سب کی سنی ہیں لیکن سمجھنے میں قاصر ہی رہا۔"

"تو یوں کہو نا کہ تمہارا کوئی خدا ہی نہیں۔"

"ہاں اگر میں کوئی خدا منتخب کرتا تو اپنا معبود اس سمندر کو بناتا جو دھمکاتا ڈراتا بھی ہے اور حیرت و استعجاب میں ڈالتا بھی ہے۔ یا اس سورج کو جو میرے لئے دن کو روشنی دیتا ہے یا ان ستاروں کو جو شب کو میری رہنمائی کرتے ہیں یا ان بادلوں کو جو مجھے کھانا اور پانی دیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی میرے دل کو نہیں لگی اور نہ ان سے میرے دل کے اندر ایسی کوئی تحریک پیدا ہوئی جو ان کی عبادت۔ طاعت اور اذعان کو ابھارے۔ میں تو مقامِ تحیر میں ہوں۔ صراطِ مستقیم اور ہدایت کا طلب گار ہوں۔ لیکن اس کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ میں اس وقت تک تمام لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی تو ضرور بسر کرتا رہا ہوں اور دنیا میں ان کا شریک حال بھی ہوں لیکن دین میں ان سے بالکل الگ ہوں۔"

"برادرِ عبسی! تمہارا تو انداز ہی نرالا ہے۔"

"تنہا میں نہیں، کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کی حالت میری ہی جیسی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اس معاملے میں اکثر غور و فکر کرتا ہوں، لیکن دوسرے لوگ بہت کم غور و خوض کرتے ہیں۔"

گفتگو کرتے ہوئے دونوں گھر پہنچ گئے اور سارا دن اور رات گئے تک یہ

ونوں کبھی دین و دنیا کی گفتگو کرتے رہتے اور کبھی تہامہ۔ نجد اور حجاز کی۔
اور حذیفہ کے دل میں اس حبشی نوجوان (یاسر) کی محبت کچھ ایسی پیوست ہو گئی
لہ یہ اپنے دل میں کہتے بلکہ جب تنہائی کا موقع ملتا تو اپنی بیوی سے بھی کہتے کہ مجھے
لسی پردیسی سے آج تک ایسی الفت نہیں ہوئی تھی جیسی اس نوجوان سے ہو گئی
ہے۔ اگر میں کسی کو اپنا متبنّیٰ بناتا تو بس اسی کو بناتا۔

(۳)

ایک مدت تک یاسر اپنے حلیف ابو حذیفہ کے مہمان کی حیثیت سے رہے
مشاغل یہ تھے کہ صبح حرم میں جاتے اور قریش سے باتیں کرتے اور ان کی باتیں
سنتے۔ زوال آفتاب کے بعد گھر لوٹتے اور کھانا کھا کر ذرا آرام کرتے۔ پھر باز
کی طرف نکل پڑتے۔ لوگوں کے حالات معلوم کرتے۔ اور وسائل معاش تلاش
کرتے۔ آخر کار جب مزدوری کی آسانیاں حاصل ہو گئیں تو یاسر نے اپنا ایک
الگ ٹھکانا بنا لیا اور وہاں منتقل ہونے کے لئے انہوں نے ابو حذیفہ سے اجاز
چاہی۔ ابو حذیفہ نے بخوشی اجازت تو دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا
اس نوجوان (یاسر) کا دل دو دبدھے میں مبتلا ہے۔ وہ جانے کا ارادہ کر رہا ہے
مگر کوئی چیز اندر سے اسے روک رہی ہے۔ وہ گھر کو کچھ ایسی حسرت بھری نگاہ سے
دیکھ رہا ہے جیسے یہاں سے منتقل ہونے میں اسے سخت مشکل اور اندوہ کا مقابلہ کر
پڑ رہا ہو ابو حذیفہ نے کہا:

"عزیز من! تم کچھ متردد اور مغموم سے کیوں ہو؟ میرا گھر تمہارے لئے کچھ
تنگ تو نہ تھا۔ گھر کے کسی شخص سے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟ جیسے تم
اب تک یہاں مقیم رہے ہو اسی طرح اس وقت تک کیوں نہیں رہتے جب تک
زندگی کی خوشی اور وسائل معاش اطمینان بخش حد تک مہیا نہ ہو جائیں؟

"نہیں ابو حذیفہ نہ تو تمہارے گھر نے مجھے ناپسند کیا ہے نہ میں نے اسے
ناپسند کیا ہے۔ مہمان داری بھی نہایت عمدگی سے ہوتی رہی ہے۔ بات یہ کہ تمہا
گھر کے اندر میری ایک ایسی "آرزو" ہے جس کے متعلق پہلے میرا گمان تھا کہ میں

اس سے بے نیاز رہ سکوں گا لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ اس سے بے نیاز رہنا میرے لئے ممکن نہیں۔"

(تعجب سے) "اس گھر میں تمہاری کوئی آرزو ہے؟ بھلا وہ کیا ہو سکتی ہے؟"

نوجوان یاسر چند لمحے کے لئے کھو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی سرخی جھلکنے لگی۔ اس نے اپنا سر اٹھایا۔ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بڑا اہم فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جس میں جرأت اور جرأت سے زیادہ شرمیلا پن تھا۔ وہ بولا:

"وہی تمہاری سیاہ فام لونڈی جسے تم سمیّہ کہتے ہو۔ اس نے میرا دل چھین لیا ہے۔ مجھے نہ اس کی نگاہوں میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی ہے نہ اس کی باتوں میں۔"

"تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں یہ لونڈی ہبہ کر دوں۔"

"نہیں نہیں بخدا میں تمہیں کوئی مالی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔"

"مجھے نقصان کیا پہنچے گا؟ سمیّہ ایک لونڈی تو ہے اور ماشاءاللہ گھر میں اور بہت سی لونڈیاں موجود ہیں۔"

"نہیں بخدا میں تمہیں اتنا بھی مالی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں تو حلیف بنانے یا حلیف بننے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ میری طرف سے تم پر کوئی بوجھ نہ پڑے بلکہ اور ہلکا ہو۔ میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ تمہاری قوم مخزوم یہ کہے کہ یاسر تمہارے گھر میں آیا تو ایک مہمان کی حیثیت سے تھا مگر جب رخصت ہوا تو اس کی حیثیت کچھ اور نکلی۔"

"تو میں اس کا باقاعدہ نکاح کر دوں اگر تم پسند کرو۔"

(ایک مسلسل ہنسی کے بعد) "ہائے افسوس۔ کیا تم چاہتے ہو ابو حذیفہ!

کہ میں تمہارے لئے لونڈیاں اور غلام پیدا کرتا رہوں۔

(یاسر کے شانے پر ہاتھ مار کر) تم نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ خیر تم اس سے نکاح تو کر لو۔ اس سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ حُر (آزاد) ہی ہوگی"

"قربانت شوم۔ تم واقعی سخی داتا ہو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ کہ تم بنی مخزوم کے لئے فخر، قریش کی زینت اور بطحا کی آبرو ہو"

"بس رہنے دو۔ زیادہ مبالغہ نہ کرو۔ کل شام کو آجاؤ اور نکاح کر کے اپنے نئے گھر میں لے جاؤ۔ اُمید ہے کہ وہ ہر طرح تمہارے لئے بابرکت ثابت ہوگی"

یاسر اپنی بیوی سمیہ کو لے کر اپنے نئے گھر میں چلے گئے۔ اور اس کے بعد ہی سے ایک عرصہ دراز کے لئے وہ تاریخ میں بے نام و نشان ہو گئے۔ تاریخ کی یہ قدیم عادت ہے کہ وہ اکثر انسانوں کو فراموش کر دیتی ہے۔ کبھی پیدا ہوتے وقت کبھی مرنے کے بعد اور کبھی شکار حوادث ہونے کے وقت۔ تعجّب کی کیا بات ہے اگر اس نے ایک ایسے عامی انسان (یاسر) کو بھی فراموش کر دیا ہو جس کی نہ "مکے" میں کوئی خاص وقعت تھی نہ قریش میں کوئی امتیاز حاصل تھا۔ بلکہ وہ صرف ایک پردیسی حلیف تھا اور "مکے" میں اس جیسے بیسیوں گمنام تھے جو اس طرح روٹی کماتے اور آسان سے آسان ذریعۂ معاش ڈھونڈتے پھرتے تھے اور جب تھک ہار کے ناکام ہو جاتے تو قریشی سرداروں کے پاس اپنی حاجت روائی کے لئے آجاتے۔ ہاں ایسے لوگوں کو اپنی جان اور مال کی طرف سے یہ اطمینان ضرور تھا کہ نہ کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا نہ کوئی نقصان پہنچائے گا۔

تاریخ تو ہمیشہ ہی سے ارستقراطی اور رؤسا نواز ہے۔ اُس وقت بھی ایسی ہی تھی۔ یہ ہمیشہ رؤسا کی طرف توجہ دیتی ہے اور اس کی نظرِ عنایت

ارباب اقتدار پر رہتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ تاریخ کچھ تنگ دل۔ کنجوس۔ متعصب اور سرکش بھی ہوتی ہے۔ رؤسا کا پہلو بچاتی ہوئی چلتی ہے۔ ارباب اقتدار کے ذکر میں بڑی احتیاط سے قدم اُٹھاتی ہے۔ ان کے صرف ان ہی پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے جن میں کچھ شرف و امتیاز کی نمائش ہو۔ اس دعوے کی ایک دلیل یہ ہے کہ تاریخ اس زمانے کے قریش کے متعلق صرف ایسی ہی چند معمولی اور غیر اہم باتیں بتاتی ہے جن سے ان کے تمام معاملات پر روشنی نہیں پڑتی۔ گویا تاریخ ان کو بہت کم وقعت و کم عزّت سمجھتی رہی۔ اس لئے ادھر اپنی توجہ بھی کم ہی رکھی۔ ورنہ اس نے تو اپنا مرکزِ توجّہ رومی قیصروں اور ایرانی کسراؤں اور ان کے اکابر و رؤسا ہی کو بنایا۔ ان ہی کو اپنی وابستگی کا زیادہ حق دار تصوّر کیا۔ ان ہی کے کارناموں کو پرکھتی رہی اور ان ہی کے متعلق معلومات جمع کرتی رہی۔ رہے قریش کے رؤسا و اکابر اور معززین، تو ان کو تاریخ نے حقارت کی نظروں سے دیکھا اور اگر ان کے متعلق کبھی کچھ معلومات دیں بھی تو بس اتنی کہ دیں جن سے بعد میں آنے والوں کے لئے تھوڑی سی تفریح کا سامان مہیّا ہو جائے اور فکر و غم سے تھوڑی دیر کے لئے نجات مل جائے۔ قریش کا شمار ان عربی قبائل میں تھا جو لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ نہ حساب و کتاب کی مہارت رکھتے تھے نہ زمان و مکان کو اپنے مقاصد کے لئے مسخّر کر سکتے تھے بلکہ زمان و مکان یا حوادث و انقلابات کے اندر سے اپنے لئے کچھ سامانِ زیست مہیا کر لیتے تھے ادریس۔ جب تاریخ کا یہ حال ہے تو اس سے متعلق کیا توقع ہو سکتی ہے کہ اس کی توجّہ ان عوام الناس کی طرف ہو گی جو نہ مالدار ہیں نہ تاجر، نہ پروہت، نہ فرمانروا، بلکہ ان کی گری ہوئی خراب و خستہ زندگی دوسروں کی محتاج ہو اور دوسرے امیروں یا باہر سے آنے والوں کے ٹکڑوں پر بسر ہوتی ہو۔"

یاسرؓ کا شمار بھی اسی قسم کے عام انسانوں میں تھا اس لئے تاریخ نے ان کی طرف کوئی توجّہ نہ کی نہ ان کی طویل زندگی میں ان کا ساتھ دیا۔ تاریخ کچھ نہیں بتاتی کہ یہ معاش کی کیا راہیں پیدا کرتے رہے اور کس کس طرح کما کما کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے رہے۔ آخر کار وہ دَور بھی آگیا جب تاریخ اس بات پر مجبور ہو گئی کہ رئیسوں، کبیروں سے بھی زیادہ عوام کی طرف توجّہ دے اور یاسر کی طرح دوسرے عوام کے حالاتِ زندگی کو اکابرِ قریش اور بنو اُمیہ وغیرہ کے رؤسا سے بھی زیادہ جمع کرے۔

یہ وہ وقت تھا جب تاریخ کی نظر بعض ایسے معمولی حوادث پر پڑی جن کی طرف عموماً لوگ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور اُدھر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ لیکن جلد ہی ان سے دلوں میں تڑپ، عقلوں میں روشنی اور روح میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہی عوام اپنے آپ کو پہچاننے لگتے ہیں۔ اپنے حقوق کا احساس و شعور پیدا کر لیتے ہیں اور اپنا حق حاصل کرنے کے لئے بے تحاشا اور لگاتار جد و جہد شروع کر دیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال پیدا ہو کر رہی اور سردارانِ قریش بھی اسے نظر انداز نہ کر سکے۔ انہوں نے کمزوروں کو دیکھا کہ ان کے دل بڑھ گئے اور نقطۂ نظر میں ایسی بلندی پیدا ہو گئی جو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے اندر آرزوئیں ایسی کروٹیں لینے لگیں جو پہلے نہ لے سکتی تھیں۔ انکی زبان پر وہ گفتگوئیں آنے لگیں جو پہلے نہ آئی تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ غلاموں میں حریّت کی ایسی بے پناہ تڑپ پیدا ہونے لگی کہ جب یہ آپس میں گفتگو کرتے تو اس انداز سے کرتے جیسے زندہ رہنے کا حق ان کو بھی اپنے آقاؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ عزّت و احترام کا وہ بھی ویسا ہی حق رکھتے ہیں۔ اپنی کمی پوری کرتے اور اپنی خستگی و بے رونقی کو دور کرنے کے وہ بھی

یے ہی حق دار ہیں۔ سب انسان مٹی سے بنے ہیں اور مٹی میں مل جائیں گے۔
ائش کا وقت ہو یا موت کی گھڑی جسمانی حالت سبھوں کی ایک جیسی ہوتی ہے
ر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر انسان اور انسان میں کوئی فرق ہو سکتا ہے تو وہ
مانی نہیں بلکہ روحانی اقدار کا فرق ہے جو نیکی کرنے، بُرائی سے بچنے، گناہ سے
وظ رہنے اور نیک عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔" وہ آپس میں یہ بھی گفتگو کرتے
دل یا روح کا یہ فرق مرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے جب کردار کی جزا سامنے
تی ہے۔ جو رائی برابر بھی نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بھی بُرائی
ے اسے پالے گا۔ وہ باہم یہ باتیں بھی کرتے کہ کسی آزاد کی محض آزادی اسے
سروں پر فضیلت نہیں بخشتی بلکہ اس کی فضیلت اس وقت ہوتی ہے جب وہ
ان لائے، تقوےٰ اختیار کرے، نیک عمل کرے اور کسی انسان کو اپنے ہاتھ،
ان یا دل سے تکلیف نہ پہنچائے۔ اس طرح کوئی غلام اگر صاحبِ ایمان و
لے ہے، حسنِ گفتار و کردار رکھتا ہے، اپنے دل اور ضمیر کو گناہ اور بدی سے
تا ہے تو اس کی غلامی اسے دوسروں سے فضیلت میں کم نہیں کر سکتی۔ ان کی
ہی گفتگو یہ بھی ہوتی کہ آزادی و غلامی، امیری و غریبی اور قوت و ضعف
ارضی چیزیں ہیں جو آنی اور جانی ہیں۔ یہ ایسی قدریں نہیں جن کی بنیاد پر
نسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز پیدا ہو یا ایک انسان دوسرے
آقا اور مالک بن بیٹھے۔ دراصل نیکی اور تقوےٰ ہی وجہِ امتیاز ہے۔ رہی
کومتی سیادت تو وہ کسی کو نہ پیدائشی طور پر ملتی ہے نہ کثرتِ اولاد و مال کی
جہ سے ملتی ہے۔ بلکہ اسے ملتی ہے جس سے لوگ راضی ہوں، جس پر اعتماد
کھتے ہوں، جس کی بات مانتے ہوں۔ لوگوں کے فیصلے ان اصولوں کی بناء
ر ہونے چاہئیں جو آسمان سے آئے ہوں۔ خیر و شر کی تشریح اور نیکی و بدی

کی توضیح صرف وہی اصول کرتے ہیں۔ ان فیصلوں کا تعلق نہ تو ان سینہ بہ سینہ روایات سے تھا جو متوارثاً چلے آرہے ہیں نہ ان طریقوں سے ہے جو زمانہ قدیم سے ان میں رائج ہیں۔

یہ غلام اور زیردست لوگ آپس میں جب ملتے یا انکی مجلس ہوتی تو اسی قسم کی گفتگو کرتے۔ بلکہ وہ یہ باتیں ایکدوسرے سے سن کران کو پھیلاتے۔ اور دعوت وتبلیغ کے انداز سے ان کی اشاعت کرتے۔ ان باتوں کی وجہ سے اکابر قریش آخر ایک دن خوفزدہ ہوکر رہے۔ یہ ہیجان انگیز آگ اس طرح پھیلی کہ انہیں متحد ہوکر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس شعلے کو اس سے پہلے ہی کہ وہ پھیل کر سب کو لپیٹ میں لے لے دبا دیا جائے۔ مگر تاریخ نے آج وہ دن بھی دیکھ لیا کہ مکے کے جن حوادث کو وہ بہت معمولی سمجھتی تھی وہ درحقیقت بڑے اہم نکلے۔ تاریخ نے آخر وہ باتیں بھی سن لیں جو زبان پر تو بہت دبے دبے اور بڑی دھیمی آواز سے آتی تھیں لیکن سینہ ودل میں پورے جوش وخروش اور بلند آہنگی سے گونج رہی تھیں۔ تاریخ نے اس نوجوان یاسر کو بھی دیکھا جو اپنی بیوی کے ساتھ اب بوڑھا ہوچکا تھا۔ اس کا حلیف ابوحذیفہ مرچکا تھا اور بطن سمیہؓ سے یاسر کے تین فرزند ہوچکے تھے، جن میں ایک تو کسی نامعلوم حادثے کا شکار ہوا، اور دو اپنے والدین کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔

یہاں یہ بھی بیان کردینا ضروری ہے تاریخ کو یاسر اور ان کی اولاد سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ تاریخ نے تو ایک دن مکےؐ میں اس لئے قدم رکھا کہ لوگوں کے بعض اہم واقعات کا مطالعہ کرے۔ لیکن مسجد (بیت اللہ) میں داخل ہونے سے پہلے اس کی نظر قریش کے کچھ ہیجانی وطوفانی گرما گرم مجمعوں پر پڑی جن میں کہیں تو محمدؐ اور ان کے پیغام کا ذکر ہورہا تھا اور کہیں ان کے پیروؤں کا جو زیر دست یا غلام تھے۔ اور کبھی کبھی یہ بھی ذکر آجاتا کہ محمدؐ اور اصحاب محمدؐ نے اپنی "خوفناک" دعوت کے نشر واشاعت کا مرکز دارِ ارقم بن ارقم کو بنا رکھا ہے۔ یہ معلوم کرکے

تاریخ ان پُرشور مجمعوں سے نکل کر دارِارقم بن ارقم کی طرف چلی تاکہ وہاں محمدؐ کو اور صحابِ محمدؐ کو خود اپنی آنکھ سے دیکھے اور ان کی باتیں خود اپنے کان سے سُنے۔ وہ ابھی اس گھر کے پاس پہنچی ہی تھی کہ دروازے پر دو آدمیوں کو کھڑا دیکھا۔ ایک تو سیاہ فام اور طویل القامت تھا اور دوسرا میانہ قد گندم گوں۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ سیاہ فام نے اپنے گندم گوں ساتھی سے پوچھا کہ تم یہاں کیسے آئے؟ گندم گوں نے کہا: پہلے تم بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟ سیاہ فام نے کہا: میں تو اس ارادے سے آیا تھا کہ محمدؐ کے پاس پہنچوں اور ان سے کچھ سُنوں۔ ان کی زبان سے کچھ معلومات حاصل کروں۔

گندم گوں بولا: میں بھی اسی ارادے سے آیا ہوں۔ اس کے بعد دونوں اندر داخل ہوئے۔ محمدؐ کا پیغام سُنا اور پیغام سُننے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ تب کہیں اس کے بعد تاریخ کو معلوم ہوا کہ اس سیاہ فام و دراز قد شخص کا نام عمار بن یاسر تھا اور اس گندم گوں میانہ قامت شخص کا نام صہیب بن سنان تھا۔ بس یہی وہ وقت تھا کہ جب سے تاریخ نے اس عنسی نوجوان یاسر کا نام اپنے صفحات میں ٹانکا۔ اور پھر ان کے فرزند عمار کے نقشِ قدم کو ڈھونڈتی پھری۔

(۴)

یاسر کچھ مضمحل، متفکر اور پریشان سے رہنے لگے۔ اپنے آپ سے وہ خود بھ
بیزار رہتے اور ان کی بیوی سمیہ بھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سویرے اُٹھ بیٹھ
نہ خود آرام کرتے نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتے۔ گھر میں بے قراری کے ساتھ
سے اُدھر لپکتے پھرتے۔ جلدی جلدی مختلف کام کرتے۔ اپنے آپ ہی زور زور
باتیں کرتے جاتے جس سے گھر والے جاگ پڑتے۔ گھر والوں کو یاسر کی یہ دھن
آپ ہی آپ زور زور سے باتیں کرنا ناگوار ہوتا۔ بعض اوقات وہ زبان سے بھ
اس ناگواری کا اظہار کر دیتے اور ان سے خاموش و پُرسکون رہنے کی فہمائش بھی
دیتے۔ مگر یاسر کوئی اثر نہ لیتے بلکہ مذاق اُڑاتے ہوئے اپنی حرکتوں اور باتوں پر ا
اڑ جاتے۔ اور تمسخر کے انداز میں اُلٹی ملامت شروع کر دیتے جس سے سونے وا
کی نیند خراب ہو جاتی۔ سمیہ کو ان کی حرکتیں اور یہ دُھن سب سے زیادہ ناگوا
تھیں کیونکہ ان کا محبوب ترین مشغلہ یہ تھا کہ جب تک سو سکتی تھیں سوتی رہتیں
ان کو گویا ہر وقت یہ خطرہ رہتا کہ گھر کے اندر ایسی ناخوشگوار صورتِ حال نہ پید
ہو جائے جو انہیں کمزور کر دے۔ اس لئے وہ جس قدر اسے ٹال سکتی تھیں ٹا
جاتی تھیں لیکن اس "نہابکو" اور خودمست بڈھے (یاسر) کو جس طرح اپنے ار
گرد والوں کی نیند خراب کر دینے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس طرح اپنی دوسر
باتوں کے ناپسند ہونے کا بھی احساس نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دل کو اس
وقت تک چین نہ آتا جب تک سارے گھر والوں کو جگا کر اپنی نہ ختم ہونے والی
تقریر نہ سُنا لیتے۔ یہ سب ان کی سنتے زیادہ اور بولتے کم تھے۔

یاسر کی باتوں کا کوئی خاص موضوع نہ ہوتا۔ ادھر اُدھر کی مختلف باتیں ہوتیں جو اپنی ندرت و جدّت کی وجہ سے سننے والوں کو حیرت میں ڈال کر کچھ اور معلومات حاصل کرنے کا شائق بنا دیتیں۔ وہ نادر و عجیب واقعات مسلسل بیان کرتے جاتے جن میں تہامۂ یمن کے دور دراز وطن کا ذکر بھی ہوتا اور اپنے ان تجارتی سفروں کا بھی ذکر ہوتا جو اُنہوں نے بنی مخزوم کے ساتھ کبھی شام کی طرف اور کبھی عراق کی طرف کئے تھے اور کبھی ان کے علاوہ کسی اور جگہ کی سیاحت کا بھی تذکرہ ہوتا۔

قریش کی اچھائی اور بُرائی کو جاننے والا یاسر سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ سردارانِ قریش پر تبصرہ کرنے سے ان کو سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ ان کی تعریفیں بھی کرتے اور اپنی کڑی نکتہ چینی اور تنقید سے انہیں بری بھی نہ کرتے۔ ان کے اہل و عیال میں جو لوگ ان کی یہ گفتگو سنتے ان کے دلوں میں ایک شوق چٹکی لینے لگتا۔ عوام الناس کو بڑے لوگوں کی باتیں سننا بہت پسند ہوتا ہے خواہ وہ خوش کُن ہوں یا رنج افزا۔ اچھی ہوں یا بُری، یاسر جب قریش کی باتیں شروع کرتے تو بڑی تفصیل سے کرتے اور سامعین کو مسحور کر دیتے۔

سمیہؓ کو تو یہ یقین تھا کہ جب تک سورج بلند ہو کر قریب بہ زوال نہ ہو جائے یاسر گھر سے باہر نہ نکلیں گے۔ لیکن ایک دن ایسا ہُوا کہ یاسر نہ اپنے بستر سے اُٹھے اور نہ ان کی زبان ہلی۔ بس وہ لیٹے رہے۔ نہ خوشی کے آثار نہ کوئی گفتگو اور نہ دوسروں کو باتوں میں دلچسپی لینے کی ترغیب۔ اس دن سمیہؓ بھی جی بھر کے اتنا سوئیں کہ اس سے پہلے کبھی نہ سوئی ہونگی۔ لیکن اس کے باوجود انہیں یاسر کا یہ سکون کچھ پسند نہ آیا۔ کیونکہ وہ یاسر کی ایسی خاموشی اور ایسے سکون کی کبھی عادی نہ تھیں۔ سمیہؓ یاسر کی طرف بڑھیں اس وقت ان کے لبوں پر بناوٹی مسکراہٹ اور

خوشی تھی ورنہ اندر سے ان کا دل بہت پریشان تھا انہوں نے یاسر سے پوچھا:
"کیا بات ہے کوئی خفگی تو نہیں؟"
(دبی آواز سے) "نہیں۔ نہ کوئی بیماری ہے نہ خفگی۔"
"تو آج گھر کو اپنے شور و غل سے محروم کیوں کر رکھا ہے"
(آواز کو تدریجاً بلند کرتے ہوئے) "تجھ سے خدا سمجھے سمیہ! تمہیں خوش رکھنے کی آخر کچھ بھی سبیل ہو سکتی ہے؟ میں چہکتا ہوں تو کہتی ہو کہ میری نیند میں خلل کیوں ڈالا، اور چپ رہوں تو پوچھتی ہو کہ آج چیخیے کیوں نہیں چلّاتے کیوں نہیں؟ میں اس وقت اس لئے چپ نہیں کہ مجھے خاموشی کچھ پسند ہے اور نہ اس لئے پُرسکون ہوں کہ سکون کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ایک ایسا خواب دیکھا ہے جس سے سخت خوفزدہ ہوں۔ بولنا چہکنا سب بھول گیا ہوں۔
سمیہ کا سیاہ اور ناشگفتہ چہرہ کسی بناوٹ کے بغیر ذرا کھل گیا۔ انہوں اطمینان کی سانس لی اور ہنس کر بولیں:
"ہر روز تم پچھلی رات کو ایسا ہی کوئی خواب کیوں نہیں دیکھ لیتے جس سے تم پر اتنا خوف و ہراس طاری ہو کہ تمہارا روز روز کا غل غپاڑہ کسی طرح بند رہے اور میں کچھ آرام سے سو سکوں۔"
یاسر نے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر بشاشت لانے کی کوشش مگر اندرونی خوف نے جلد ہی ان میں سنجیدگی اور متانت پیدا کر دی۔ وہ بولے
"اری سمیہ! یہ خواب عام خوابوں جیسا نہیں۔ اس میں کوئی خاص بات ہے۔ اس سے پہلے مجھے پریشان خواب آتے تو رہے ہیں مگر ہمیشہ جاگنے کے بعد وہ ذہن سے نکل گئے ہیں لیکن اس خواب نے تو میرے دل میں اور عقل و خرد میں بلکہ آنکھوں کے سامنے بھی ایک ایسی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے جو کسی طرح سے

مٹنے کا نام نہیں لیتی۔"

"اچھا تو بیان کرو اپنا خواب۔ شاید بیان کرنے ہی سے تمہیں کچھ سکون ملے۔"
یاسر آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور ٹھہر ٹھہر کر اپنا خواب بیان کرنے لگے۔
ابھی چند ہی لفظ زبان سے نکلے تھے کہ ان کی بیوی گھبرا گئیں۔ اگر سمیہ میں ہمّت و غیرت نہ ہوتی تو وہ یاسر کو یہ خواب بیان کرنے سے روک ہی دیتیں۔ یاسر نے کہا:

"میں تم سے خواب ہی نہیں بیان کروں گا بلکہ جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا اور جاگنے کے بعد بھی دیکھ رہا ہوں اس کی مکمل تصویر کھینچ کر سامنے رکھ دوں گا۔ میں نے دیکھا کہ ایک وادی ہے جو نہ بہت وسیع ہے نہ بہت تنگ۔ درمیانی قسم کی وادی ہے جس کے دونوں طرف بڑے بڑے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اُن کی طرف ایک راستہ ہے مگر وہ اوپر تک نہیں پہنچتا۔ اتنے میں دونوں پہاڑ پھٹتے ہیں اور ان میں بے شمار غار اور شگاف پڑ جاتے ہیں۔ ان کو میں دیکھ تو رہا ہوں مگر شمار نہیں کر سکتا۔ پھر ان غاروں سے آگ نکلنے لگی اور ہر آگ دوسری کی طرف بڑھ بڑھ کر آپس میں مل گئی اور مل کر اس طرح وادی میں بہنے لگی جس طرح پانی بہتا ہو۔ سامنے ہی وادی کے اس کنارے بہت شاداب مرغزار تھے جن میں شیریں پانی بہ رہا تھا۔ آگ وہاں تک نہیں پہنچ پاتی۔ بلکہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ تم اے سمیہ! ان ہی شاداب مرغزاروں میں کھڑی ہو تمہاری جوانی لوٹ آئی ہے۔ تمہارا چہرا آفتاب کی طرح چمک رہا ہے۔ تم میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہو۔ اپنی آنکھوں اور انگلی کے اشارے سے کچھ کہہ کہہ کر مجھے بلا رہی ہو۔ میرے پیچھے عمار کھڑا مجھے ہمت دلا رہا ہے کہ اس آگ کو پار کر جاؤ۔ وہ مؤثر و ترم لہجے میں کہہ رہا ہے کہ: ابا جان کوئی ڈر کی بات نہیں۔ بس دو ایک شعلے ہی تو ہیں۔ پھر

اس پار باغ ہی باغ ہیں ہرے بھرے۔ دیکھئے وہاں جاکر آدمی جوان ہو جاتا ہے اور آپ کا شباب بھی اس پار آپ کا انتظار کر رہا ہے" میں خواب ہی میں اے سمیہ! تمہاری پکار بھی سن رہا تھا۔ چنانچہ میں نے وہیں ارادہ کیا کہ اس آگ کو پار کر جاؤں لیکن شعلوں کی لپٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔"

اتنا بیان کرنے کے بعد یاسر اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر چلّائے کہ:

"ہائے میں اب بھی آگ کی وہ گرمی محسوس کر رہا ہوں۔" سمیہؓ بھی ڈر گئیں۔ گھبرا گئیں مگر بولیں:

"اس میں ڈر کی کیا بات ہے۔ چلو۔ اٹھو پہلے کھانا کھا لو اس کے بعد کسی کاہن کے پاس چلے جاؤ۔ یہ ڈراؤنا خواب اس سے بیان کرو۔ شاید اس کی کوئی تعبیر نکل آئے۔"

مگر اس دن جب شام ہوئی تو خواب نے اپنی تعبیر خود پیش کر دی اور یاسر نے آگ کی پوری پوری گرمی بھی محسوس کر لی۔

(۵)

یاسر مسجد حرام کی طرف پلٹ کر گئے۔ بنی مخزوم کے مجمعے میں پہنچے۔ سلام کر کے بیٹھ گئے۔ لیکن اُنہوں نے دیکھا کہ لوگوں کے چہروں پر اُن کے آنے سے کوئی بشاشت نہیں آئی۔ سلام کا جواب بھی بڑی پست آواز میں دیا گیا، بلکہ بعضوں نے تو بڑی دیر کے بعد دیا اور بعض تو اپنی باتوں میں اس طرح لگ گئے جیسے اس آنے والے کی طرف کوئی رُخ ہی نہیں۔ یاسر اپنی اس کبیدگی کو دل میں چھپائے رہے اور وہاں زیادہ دیر نہ رُکے۔ ان کو معلوم تھا کہ بنی مخزوم میں خوشامد پسندی کی عادت ہوتی ہے۔ اگر یاسر کے دل میں ابو حذیفہ کے حلیف ہونے کا پاس نہ ہوتا تو وہ اس وقت مخزومیوں کو چھوڑ کر کسی دوسرے قریشی قبیلے کے حلیف بن جاتے۔ لیکن اُنہوں نے جس طرح ابو حذیفہ کی زندگی میں وفا کی اس طرح اس کے مرنے کے بعد بھی وفا پر قائم رہے۔ اور حلف کا یہ پاس لحاظ یاسر کے لئے تھا بھی ضروری۔ ابو حذیفہ نے ان کو برباد ہونے سے بچایا۔ خوف کے ماحول سے امن میں پہنچایا۔ سمیہؓ سے شادی کر دی۔ وہ سمیہ جو اب یاسر کے لئے محبوب ترین ہستی تھی۔ ان کی آنے والی نسل کو آزادی عطا کی اور اس طرح یاسر کا وہ گھرانہ جو پہلے نیم آزاد اور نیم غلام تھا مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔

بنی مخزوم کے مجمعے میں یاسر تو اس ارادے سے گئے تھے کہ ان سے اپنا یہ ڈراؤنا خواب حسب معمول اپنے دلچسپ انداز سے بیان کرینگے اور ایک خاص انداز سے ان سے تعبیر دریافت کریں گے۔ لیکن جب ان لوگوں کی یہ رکھائی اور بے رُخی دیکھی تو زبان روک لی اور خاموش بیٹھے رہے حالانکہ پہلے بنی مخزوم کا یہ رویّہ

تھا کہ جب بھی وہ یاسر کو کسی مجمعے یا کسی گھر میں دیکھتے تو ہنسی کھیل کی باتیں کر
انہیں دلچسپ گفتگو پر اُبھارتے۔ لیکن آج تو اُنہوں نے ایک قابلِ نفرت
سرد مہری محسوس کی۔ نہ ان سے کسی نے کوئی بات کی نہ کوئی سوال جواب ہو
یاسر کی عادت تھی کہ وہ ان مغروروں کا انتظار کرتے۔ جب وہ یاسر کے گرد جمع ہو
تو وہ ان کے غرور سے کھیلتے اور انہیں وہ کچھ سنا دیتے جو وہ عام حالات میں سننے
عادی نہ ہوتے۔ اگر یہ معمول ان کا نہ ہوتا تو وہ شاید اس وقت اُٹھ کے قریش
کسی دوسرے مجمعے میں چلے جاتے لیکن وہاں چُپ چاپ اطمینان سے بیٹھے دل
دل میں اس بے رُخی کے انتقام کی اسکیمیں بناتے رہے۔ ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہو
اور کسی نے ان سے گفتگو بھی نہ کی تھی کہ دفعتہً عمرو بن ہشام (ابوجہل) نے پوچھ

"یاسر آج تمہیں اتنی دیر کیسے ہو گئی؟"

(ذرا تمسخر کے لہجے میں) "معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں میری بڑی ضرورت

ابوالحکم (ابوجہل)

(اپنے غصّے کو چھپاتے ہوئے) فی الواقع مجھے تمہاری ضرورت تھی کیونکہ
تم سے ایک بات دریافت کرنی تھی جس کی وجہ سے تمہارا معاملہ بہت مش
ہو گیا ہے۔"

"اچھا وہ کیا"

"بات یہ ہے کہ تمہیں میں نے کبھی اپنے خداؤں کے قریب بھی جاتے نہ
دیکھا اور نہ کبھی ان کا ذکر کرتے سنا۔"

(ہنس کر) کیا مجھے ان خداؤں کو بُرائی سے یاد کرتے دیکھا ہے یا کوئی
ایسا کرتے دیکھا ہے۔ جو ان خداؤں کو تکلیف
دے؟"

"اس کی تو صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ہمارے خدا ہیں اور تمہارا ان سے کوئی
سطہ نہیں۔"

"تو تم اپنے ان خداؤں کے لئے مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

(چہرے اور آواز میں جلالی شان پیدا کرتے ہوئے) "میں صرف یہ جاننا
ہتا ہوں کہ کون ہمارے ساتھ ہے اور کون ہمارے خلاف۔ اب وہ وقت آ چکا
، کہ ہر وہ شخص جو مکّے میں رہتا ہے یہ واضح کردے کہ وہ خود کیا ہے اور اس کے
یں کیا ہے۔ ہم اس سے پہلے کے لوگوں سے درگذر کر چکے ہیں لیکن اب کسی کو
اف نہیں کر سکتے۔"

"ابوالحکم اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ میں نے جس دن سے تمہارے چچا ابو
یفہ سے یہ عہد و پیمان کیا ہے کہ جس سے تمہاری جنگ اس سے میری جنگ
رجس سے تمہاری صلح اس سے میری صلح، اس دن سے آج تک تمہیں اور
ہاری قوم کو میری طرف سے کوئی برائی دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اور میں
س دن سے تمہارے اس حرم میں آیا ہوں اس دن سے آج تک ایسی باتیں بھی
ہاری زبان سے سننے میں نہیں آئی تھیں جو آج سُن رہا ہوں۔"

عمرو بن ہشام یہ سُن کر ایسی ہنسی ہنسا جس میں غصّے کا عنصر خوشنودی سے
یادہ تھا۔ پھر اس نے کہا:

"تو ذرا بتاؤ آج سے تمہاری اپنے فرزند عمار سے بھی جنگ رہی۔"

"ابوالحکم! صاف صاف بات کرو۔ آج تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں
آ رہی ہیں۔"

"یاسر تمہیں معلوم نہیں کہ کل تمہارا بیٹا عمار صابی ہو گیا ہے اور محمدؐ د
اصحاب محمدؐ کی باتیں ماننے لگا ہے۔"

یہ سُن کر یاسر پر ایک مدہوشی سی طاری ہونے لگی۔ ان کے لبوں پر تا
پڑ گئے۔ چہرہ زرد ہو گیا اور پسینہ چھوٹنے لگا۔ کچھ دور پر سردارانِ مخزوم ایک
دوسرے کو ایسی نظروں سے جلد جلد دیکھنے لگے جن میں سوال سے زیادہ تعج
پنہاں تھا۔ عمرو بن ہشام نے کچھ بولنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے چچا ولید بن
مغیرہ نے کہا:

"عزیزِ من اب آگے کچھ نہ کہو۔ اس بڈھے (یاسر) کی حالت نہیں دیکھتے
اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو۔ اس کا فرزند (عمار) چالیس سال سے زی
کا ہو چکا ہے اس لئے اس کے گناہوں کا کوئی بوجھ اس کی گردن پر نہیں۔"

ادھر سردارانِ مخزوم نے بھی ولید کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس دور
میں یاسر کے حواس رفتہ رفتہ بجا ہوئے اور انہوں نے جب یہ دیکھا کہ لو
خاموش ہیں تو انہوں نے عمرو بن ہشام سے کہا:

"ابوالحکم تم اپنے حلیف (مجھ) پر بہت غلط الزام لگا رہے ہو۔ میں نے
کل عمار کو دیکھا ہے نہ آج۔ اور مجھے یہ بھی علم نہیں کہ کل سے آج تک اس پر کی
گذری ہے۔ تم اپنی سخت روی کا بے محل استعمال کر رہے ہو اور ملامت ا
کر رہے ہو جو اس کا مستحق ہی نہیں۔ تم اپنی یہ تیزی ارقم بن ابی الارقم کو کیوں نہیں
دکھاتے؟ وہ بھی تمہاری ہی طرح کا ایک مخزومی سردار ہے۔ اگر عمار واقعی صا
ہو گیا ہے۔ (جس کا مجھے ابھی تک علم نہیں) تو اس سے پہلے تو ارقم صابی
ہے۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ ارقم نے اپنے گھر کو ایسی بیٹھک بنا دیا ہے
جہاں محمد اور ان کے ساتھی آپس میں ملتے ہیں اور اس گھر سے ان کا پیغا
پھیلایا جاتا ہے اور وہیں سے تمہارے خداؤں کی بُرائی اُبھرتی ہے۔ اس
باوجود تم ارقم بن ابی الارقم سے ڈرتے ہو۔ صرف اس لئے کہ اگر تم نے ا

کوئی زک پہنچانے کا ارادہ بھی کیا تو اس کے باپ کی اولاد حمایت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ تمہارے چچا ابو حذیفہ کے حلیف (یاسر) کی یہ پوزیشن نہیں۔ اگر آج ابو حذیفہ زندہ ہوتے تو تمہارا انداز وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔"

یہ کہہ کر یاسر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت وہ گویا ایک بوجھ کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ غمگین اور شکستہ دل ہو رہے تھے۔ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور بنی مخزوم کو آپس میں ایک دوسرے پر ملامت کرتے ہوئے چھوڑ گئے۔

(۶)

یاسر اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اندر داخل ہوئے۔ تو انہیں گھر اور گھر والوں کی ہر بات میں عجیب سی کیفیت نظر آنے لگی جو پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اپنی بیوی سمیہ کو دیکھا کہ بے حد خوش ہیں۔ پھولے نہیں سماتیں۔ رنگ کالا ہونے کے باوجود چہرہ دمک رہا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ اور شوہر سے بڑی خوشی اور خندہ روئی کے ساتھ پیش آرہی ہیں۔ وہ ابھی قریب آئے ہی تھے کہ سمیہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئیں۔ آواز میں حسرت و مسرّت کی آمیزش جھلک رہی ہے۔ وہ بولیں:

"یاسر مبارک ہو کہ عمار ہمارے پاس دنیا اور آخرت کی بہترین نعمت لے کر آیا ہے"۔

(حیرت سے) "آخرت — کیا مطلب — تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں آج سخت ناگواری کے عالم سے گذر رہا ہوں۔ رات کے خواب نے مجھے خوفزدہ کر رکھا ہے اور اب دن کو کسی کی بھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ یہ سُن کر عمار بولے:

"ہاں ابّا جان! مبارک ہو کہ میں دُنیا اور آخرت کی بہترین نعمت لیکر آیا ہوں"۔

"ذرا کھول کر بیان کرو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ تم صابی ہو گئے ہو۔ ہائے افسوس یہ تم نے اپنے ماں باپ پر کیا ظلم ڈھایا"۔

(بڑی نرمی سے ہنس کر) یوں کیوں نہیں فرماتے کہ آپ نے اپنے والدین پر کیا ظلم ڈھایا ہے؟ میں تو آپ دونوں کے لئے دُنیا و آخرت کی بہترین نعمت

لایا ہوں۔ میرے صابی ہونے کے متعلق آپ کو جس نے بھی بتایا ہے وہ صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے میں نے اسلام قبول کر لیا ہے، یعنی اس اللہ کے آگے سر جھکا دیا ہے جو آسمان۔ زمین۔ سورج۔ چاند اور ستارے سب کا خالق ہے۔ اور جس نے محمدؐ کو ہماری طرف اس لئے بھیجا ہے کہ وہ ہمیں صحیح راستہ بتائیں۔ ہمارے احوال کی نگہداشت کریں۔ اور ہم سبھوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لائیں۔ جہالت و گمراہی اور بے عقلی سے ہٹا کر حکمت، ہدایت اور عقل کا راستہ دکھائیں۔ ہر مومن متقی کو یہ خوش خبری دیں کہ جب تک وہ زندہ ہے رضائے الٰہی کی نعمت سے سرفراز رہے گا اور مرنے کے بعد بھی اس کی خوشنودی حاصل رہے گی۔ خدا نے اس فہمائش کے ساتھ انہیں بھیجا ہے کہ اس پیغام کو جھٹلانے اور نافرمانی کرنے والوں پر زندگی میں بھی پھٹکار ہوگی اور مرنے کے بعد بھی جہنّم کا عذاب ہوگا جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔"

بوڑھے یاسر نے عمار کی یہ ساری باتیں خوب کان لگا کر سُنیں۔ ان کی یہ باتیں صرف کانوں میں نہیں بلکہ دل کے اندر اُترتی جا رہی تھیں۔ یاسر کا چہرہ دھیرے دھیرے دمکتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ پورا چہرہ نور بن گیا۔ مگر ان کی قوت آہستہ آہستہ سلب سی ہو گئی۔ اور اگر فرزند اور بیوی دونوں تیزی سے انہیں سہارا دے کر نہ بٹھا لیتے اور انہیں اپنی خوش آیند باتوں سے ان کو تسکین نہ دیتے تو بہت ممکن تھا کہ یاسر گر پڑتے اور ہلاکت کے قریب پہنچ جاتے۔ عمار ان کے سر سہلاتے رہے اور سمیہ ان کے چہرے سے پسینہ پونچھنے لگیں۔ یاسر گم سم تھے اور زبان میں بولنے کی سکت نہ تھی۔ صرف اتنا بول سکے:

"پھر تو وہی بات ہوئی۔ وہی بات ہوئی۔"

عمار نے آہستہ سے پوچھا:

"ابّا جان! آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

آنسوؤں کی آمد نے حلق سے نکلنے والی آواز کو روک دیا۔ آنکھوں سے چہرے پر موٹے موٹے آنسو لگاتار گرنے لگے اور بڑی مشکل سے یاسر نے کہا:

"یہ وہی بات ہے۔ بیٹے تم نے وہ بات مجھے یاد دلا دی جو میرے اور ابو حذیفہ کے درمیان اس وقت ہوئی تھی جب میں مکّے میں آیا تھا اور میری عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابو حذیفہ نے اپنے خداؤں کے پاس جاکر مجھ سے محالفہ (عہد و پیمان) کرنا چاہا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ جب اس نے مجھ سے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ اگر میں کسی کو معبود بناتا تو اس ڈراؤنے سمندر کو بناتا یا نور پاش سورج کو یا راہنما ستاروں کو۔ لیکن ان میں سے بھی کوئی چیز میرے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ نہ میرے دل میں ایسی کوئی تحریک پیدا ہو سکی جو ان چیزوں کی رغبت یا خوف پیدا کر سکتی۔ محمدؐ نے تمہیں یہی بات تو بتائی ہے کہ ان تمام نشانیوں کا کوئی اور خالق ہے جس نے ان سب کو ایک خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور ان کو ایک نظام میں جکڑ دیا ہے۔ تو آخر یہ وہی بات ہوئی نا۔"

اس کے بعد بڈھے یاسر کا سر دیر تک جھکا رہا کچھ سوچتے رہے اور آنکھوں سے مسلسل موٹے موٹے آنسو گرتے رہے۔ پھر سر اٹھا کر بولے:

"بات وہی ہے۔ اس لئے میں نے اپنے وطن کے قرب پر اس دوری کو ترجیح دی ہے۔ اور اس لئے میں بنی عنس کی قوت بازو بننے کی بجائے بنی مخزوم کا حلیف بنا تھا اور اپنے دونوں بھائیوں کو تہامہ کی طرف روانہ کر کے خود اس بطحا میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔"

پھر اپنی بیوی سمیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر

ہوئے بولے :

"یہ تمہاری محبّت ہی تھی جس نے مجھے اس آنے والے وقت کا منتظر بنا رکھا تھا"

اس کے بعد یاسر نے کئی بار اپنا سر جھکایا اور پھر اُٹھایا۔ ان کے آنسو تھم چکے تھے مگر قطراتِ اشک ان کی داڑھی پر اب بھی چمک رہے تھے۔ وہ اپنے فرزند عمار سے مخاطب ہو کر کہنے لگے :

"تم مجھے کلمۂ حق سنانے کے لیۓ محمدؐ کے پاس کب لے چلو گے؟"

عمار نے کہا :

"اگر آپ دونوں کا جی چاہے تو ابھی چلیۓ"

اب شام ہو چکی تھی۔ یکایک ابو جہل یعنی عمرو بن ہشام بنی مخزوم کے چند آزاد اور چند غلام افراد کو لیۓ ہوئے آپہنچا۔ عمار اپنے والدین کے ساتھ آہنی زنجیروں میں جکڑ دیۓ گئے۔ یاسر کے گھر میں آگ لگا دی گئی۔ اور لوگ عمار و یاسر و سمیہ کو گھسیٹتے ہوئے قید خانے کی طرف لے چلے تو یاسر نے سُمیّہ سے کہا :

"سمیہ تم نے دیکھا یہ وہی پہلی آگ ہے جو میں نے خواب میں دیکھی تھی"

عمار نے کہا :

"اور آگ کے اس پار وہ بہشت ہے جس میں نعمتوں کے علاوہ رضائے الٰہی بھی ہے مگر صرف اس کے لئے جس نے محمدؐ کی تصدیق کی اور ان کی دعوت پر لبیک کہی ہو"

(۷)

مسجد حرام میں بوقتِ چاشت سردارانِ قریش جمع تو ہوگئے لیکن گفتگو خرید کی ہوئی نہ فروخت کی۔ سب کی گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا اور وہ ایک بڑا واقعہ تھا جس کی پہل ایک مخزومی نوجوان نے کی وہ بھی ایک ایسے پُرامن (مکّے) میں جس کے بسنے والوں نے ایسا کوئی عہد نہیں کیا کہ گھروں کو آگ لگ جائے گی یا مردوں عورتوں کو زنجیروں میں جکڑا جائے گا یا ان کو طرح طرح کی سزائیں دی جائیں گی اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ انہوں نے نہ کسی کو قتل کیا ہو نہ چوری کی ہو اور نہ کوئی ایسا جرم ہی کیا جسے قریش قابل نفرت یا سزا پاداش تصوّر کرتے ہوں۔

ولید بن مغیرہ کہتا ہے:

"خدا تم سے سمجھے اے برادر زادے تم نے اس پُرامن حرم میں ایک ایسی بات کی ہے جو قریش کی روایات کے مطابق نہیں تم نے جو کچھ کیا اس میں ہم لوگوں سے مشورہ بھی نہ لیا نہ ہمارے دانش مندوں نے یہ کچھ تجویز کیا اور نہ تمہاری قوم کے اہل الرائے نے اس کی رائے دی۔ تم نے اپنی خواہش کی پیروی کی اور فریب نفس کے چکّر میں آگئے۔ ہمارے چند بے وقوف نوجوان اور بے عقل غلام تمہارے پیچھے لگ گئے۔ تم نے جو نئی قسم کی حرکت کی ہے اس کے نتائج سے مجھے ڈر ہے۔ عربوں کے دل میں اس حرم کی ایک خاص وقعت و منزلت ہے۔ جہاں انہیں خوف نہیں ہوتا اور وہ بھوکے نہیں رہتے اور جو راحت و فراخی اور امن و آزادی وہ یہاں پاتے ہیں کسی اور جگہ نصیب نہیں۔ کیا کہیں گے عرب جب

ہیں گے کہ جو لوگ اس حرم میں پناہ لینے آتے ہیں اور اس گھر کے زیر سایہ رہتے
ں انہیں نہ کوئی راحت ملتی ہے نہ فراخی۔ نہ امن نہ عافیت۔ بلکہ ان کے گھر
ائے جاتے ہیں۔ انہیں زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔ اور طرح طرح کی سزائیں
ی ہیں۔ کیا کہیں گے لوگ جب یہ معلوم ہو گا کہ قریش کے نوجوان اور احمق لوگ
رکشی وطغیانی کرنے لگے ہیں۔ اپنی قوم کے سرداروں، عاقلوں اور اہل الرائے
گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اپنی رائے پر چلتے اور اپنی خواہشوں کی پیروی
تے ہیں، نہ کسی پڑوسی کا پاس لحاظ کرتے ہیں نہ کسی پناہ گزین کا خیال۔ مخزومیو
۔ لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ وہ ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیں اور تمہارے اور
ہارے ساتھیوں کے مقابلے میں انصاف کا ساتھ دیں۔"

ابو جہل یہ سُن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ چہرہ
رخ ہو گیا۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ وہ بولا:

"خبردار۔ لات وعزیٰ کی قسم جب تک میرے ہاتھ میں یہ تلوار ہے اس
قت تک تو تم لوگ ان قیدیوں کی طرف قدم بھی نہیں بڑھا سکتے۔ میں خوب
سمجھتا ہوں کہ میں نے اس حرم میں ایسا انوکھا کام کیا ہے جو یہاں کے باشندوں
کی روایات و روش کے خلاف ہے۔ لیکن چچا جان! آپ جانتے ہیں کہ اسمیں
پہل محمدؐ نے کی ہے اور اس نے اس حرم میں ایک ایسا نرالا کام کیا ہے جو یہاں
کے لوگوں کی روایات کے بالکل مطابق نہیں۔"

(نرمی سے) "افسوس ہے برادر زادے! محمدؐ نے کوئی گھر تو نہیں جلایا؟
کسی پر سختی تو نہیں کی؟ کسی کو زنجیروں میں جکڑا تو نہیں؟"

"اس نے تو اس سے بھی زیادہ بدتر کام کیا ہے۔ اس نے ہمارے غلاموں
میں فساد برپا کر دیا ہے۔ عوام کو ہمارے خلاف ابھار دیا ہے۔ بلکہ ہمارے

خداؤں کے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ اور پھر اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہمارے
دولت اور ہمارے مرتبے کے خلاف بھی پروپیگنڈا کرتا ہے۔ ان کو وہ رتبہ
منزلت حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جو ہم لوگوں کا موروثی حصہ ہے۔ ا
مراتب پر ہم یوں ہی قائم نہیں رہے بلکہ اس کے تحفظ کے لئے ہر طاقت اور
کوشش صرف کرتے رہے۔ تم ان غلاموں کو جو اس کے پیرو ہو گئے ہیں دیکھ
نہیں؟ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ہماری ہی طرح کے ہیں اور ہماری ہی طرح ان۔
بھی حقوق ہیں اور خمیازۂ عمل بھگتنے میں بھی ہم اور وہ برابر ہیں بلکہ وہ اللہ
نزدیک درجہ و مقام میں ہم سے بلند تر ہیں کیونکہ وہ اپنے دلوں کو اللہ کے
مخصوص رکھتے ہیں اور صرف اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ لات
منات، عزیٰ اور ہبل کو شریک نہیں کرتے۔ لہٰذا وہ تو صاحب عقل و را
ہوئے اور ہم احمق و بے وقوف ٹھہرے۔ افسوس ہے چچا جان! اگر آپ
لوگوں نے محمدؐ اور ان کے اصحاب کو زمین پر یہ دعوت پھیلانے کے لئے چھ
دیا تو وہ دن دور نہیں کہ آپ دنیا کے سربلندوں کو سرنگوں کرنے کے
ذمے دار ہوں گے اور ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے جو اعزاز و شرف اور ثر
و اقتدار وراثتاً ملا ہے اسے آپ ضائع کر دینگے۔ بتائیے ان دو باتوں میں سے
کون سی زیادہ بُری ہے؟ عرب کا یہ سُننا کہ مکے کے سمجھدار لوگ بے وقوفوں
ڈانٹ ڈپٹ کر ان کو صحیح راستے پر لا رہے ہیں یا یہ مکّے کے غلام سردار اور ہم
غلام بن گئے ہیں۔ اور جن خداؤں کے لئے لوگ دور دور سے حج کرنے آ
ہیں وہ خدا مذاق بن گئے ہیں؟ میں پھر کہتا ہوں کہ جب تک میرے اس ہا
میں یہ تلوار ہے اس وقت تک آپ ان قیدیوں کی طرف قدم بھی نہیں بڑھ
سکتے۔"

امیہ بن خلف بولا :

"ابوالحکم تم نے صلۂ رحمی کا حق ادا کیا۔ کل تم نے جو کچھ کیا خوب کیا اور آج بھی جو کچھ کہا خوب صحیح کہا۔ بات یہ ہے کہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کا معاملہ صرف اس لئے قابلِ غور ہے کہ اس قریشی قبیلے (بنی ہاشم) کو قوت حاصل ہے۔ اگر اس سے یہ قوت چھین لی جائے تو یہ معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ تمہارے چچا (ابو حذیفہ) نے اگر اپنے غلاموں اور حلیفوں کے ساتھ وہی سلوک کیا ہوتا جو میں اپنے ایسے لوگوں کے ساتھ کر چکا ہوں تو تمہاری بات کی نہ اتنی تردید کی جاتی نہ تمہیں مستحقِ ملامت سمجھا جاتا۔ بنی مخزوم کے حلیفوں اور غلاموں کے ساتھ تم نے کل جو کچھ کیا ہے وہی میں خود بنی جمح کے ساتھ کر چکا ہوں۔ بخدا اے قریشیو معاملہ اب تمہارے قابو سے باہر ہو رہا ہے اور ایک ناخوشگوار جنگ تمہاری طرف بڑھ رہی ہے بلکہ تمہارے گھر کے وسط میں آگئی ہے۔ اگر تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری دولت غلاموں، لونڈیوں اور آفاقی رذیلوں کے قبضے میں چلی جائے۔ اگر تمہیں یہ گوارا ہے کہ اس گھر کی حرمت باقی نہ رہے۔ ان خداؤں کا ہمہ گیر ذکر ختم ہو جائے اور عرب ارادۂ حج اور تمہاری سرپرستی سے محروم ہو جائیں اور تم داستان پارینہ بن کر رہ جاؤ . . . . تو بے شک محمدؐ اور اس کے ساتھیوں کو کھلی چھٹی دے دو کہ وہ جو چاہیں کریں۔ لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے مال و دولت کو محفوظ رکھو۔ تمہارے خداؤں کا اقتدار باقی رہے۔ اس حرم کی یاد لوگوں کے دلوں کے اندر باقی رہے تو اپنے بازوؤں کو مضبوط کرو۔ اپنی عقلوں کو کام میں لاؤ۔ اس معاملے کا ڈٹ کر سر توڑ مقابلہ کرو۔ اور ان احمقوں کے پھیلائے ہوئے فساد کو ابھی سے روک دو"

ابوسفیان نے کہا:

"مجھے تو یہ خطرہ درپیش ہے کہ میں کل تم لوگوں کا مال تجارت لے کر شام یا یمن کی طرف نہ جا سکوں گا۔ یا جانے کے چند ماہ بعد واپس آؤں تو یہ دیکھونگا کہ مالدار لوگ اپنے گھروں سے باہر پڑے ہیں اور منتشر کر دئے گئے ہیں۔ اے قریشیو! تجارت مال کی ہوتی ہے اور اس میں منافعے کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن کوئی تجارت اس وقت تک نفع بخش نہیں ہو سکتی جب تک اس کی پشت پر کوئی قوت نہ ہو۔ تم عربوں کی خاطر مدارات تو کر لیتے ہو کہ شام و یمن کی طرف تجارتی قافلوں کی راہیں محفوظ رہیں لیکن یہ کتنی عجیب بات ہوگی کہ اپنے ہی گھر کی تجارت کو محفوظ رکھنے سے عاجز رہو۔ اب تو میں کہیں باہر تمہارا مالِ تجارت لے کر اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ تم سب میری پشت پر موجود ہو اور میں جب مکے میں واپس آؤں تو اپنے بال بچوں کو ویسا ہی امن میں پاؤں جیسا رخصت ہوتے وقت چھوڑ گیا تھا۔ اس دوران میں ان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

ولید بن مغیرہ ہنس کر بولا:

"خدا تمہارا بھلا کرے تم نے میرے برادرزادے (ابوجہل) سے جو گفتگو کی ہے اس نے ہم سبھوں کے دلوں کی ترجمانی کر دی۔ تم سبھوں پر تو خوف و ہراس طاری ہے جس نے تمہارے معاملے کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ اس دہشت نے تمہاری حالت اس قدر متغیر کر دی ہے کہ تم اس چھوٹے سے گروہ کے معمولی سے معاملے کو بھی بہت بڑا سمجھنے لگے ہو۔ ورنہ یہ صرف باتیں بناتے ہیں اور اب تک ان سے علانیہ نہ کوئی جانی نقصان پہنچا ہے نہ کوئی چھوٹا یا بڑا مالی نقصان۔"

ابوسفیان نے کہا:

"تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب تک وہ ایسا کر نہ گزریں اس وقت تک ہم انتظار کرتے رہیں؟"

ابو جہل بولا:

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ زور پکڑنے سے پہلے ہی اس فتنے کو ختم کر دوں۔ لہٰذا ابو سفیان! تم جہاں جانا چاہو ہمارے مال تجارت کو لے کر چلے جاؤ۔ تمہاری پشت پناہی اور تمہاری خواہش کے مطابق "مکے" کی حفاظت میرے ذمے رہی۔"

عتبہ ابنِ ربیعہ بولا:

"اے قریشی بھائیو! تم میں جس نے بھی جو جو باتیں کیں وہ بہت معقول ہیں۔ ہم بخدا یہ نہیں پسند کر سکتے کہ ہم پر بے عقلی کا طعنہ دیا جائے۔ ہمارے خداؤں پر نکتہ چینی کی جائے یا ہمارے مال و دولت پہ کوئی بُرا وقت آپڑے۔ مگر ہاں پُرامن اور معقول راستے پر چل کر ہم تشدد اور سختی سے بچ سکتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کریں کہ اپنی قوم کے جو احمق لوگ ہیں ان سے تو سنجیدگی اور نرمی سے پیش آئیں۔ مگر جو غلام اور حلیف ہیں ان پر خوب تشدد کریں۔ اگر ہم ایسا کر لیں تو ہمارے آپس میں تو صلح قائم رہے گی اور غلاموں یا حلیفوں کے ساتھ جو سلوک کرینگے وہ دوسروں کے لئے نمونہ عبرت بن جائے گا۔"

ابو جہل بولا:

میں نے تو یہی کیا ہے۔ لات و عزیٰ کی قسم اگر میں نے اپنے نفس کی اطاعت کی ہوتی تو اب تک ارقم بن ابی ارقم کو قتل کر چکا ہوتا۔ اس کے گھر کو گھر والوں سمیت نذرِ آتش کر دیتا۔ اس سے میرے دل کو ایک گونہ تسکین بھی ہو جاتی لیکن میں بنی مخزوم کی بھلائی کا خواہاں ہوں اور کمزور عوام کو صابی ہو جانے والے قریشیوں کے لئے نمونۂ عبرت بنا رہا ہوں۔"

ولید بن مغیرہ نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا:

"برادر زادے یہ تم نے کوئی کمال نہیں کیا۔ قوی اپنی قوّت کو اپنے ہی جیسے پر آزماتا ہے۔ اگر کمزوروں اور غلاموں پر ہاتھ صاف کیا جائے تو یہ بُزدلی و نامردی ہے۔ کمزوروں کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟"

اس گفتگو کے بعد قریش منتشر ہو گئے اور ابوجہل کے سوا ہر شخص اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ ابوجہل سیدھا غلاموں کی طرف گیا۔ ان قیدیوں کو جو قید خانے میں رات سے بندھے پڑے تھے باہر نکالا۔ جانوروں کی طرح ہنکا کر لے چلا بار بار تیز قدم اُٹھانے کی فہمائش کرتا۔ قیدی بیچارے اتنی تیزی سے قدم کہاں اُٹھا سکتے تھے۔ لیکن ابوجہل اور اس کے ساتھی خنجروں سے ان کو کچوکے لگاتے جاتے۔ ان چرکوں سے بدن زخمی ہوتا اور خون بہتا جاتا لیکن اس کا کوئی اثر ان کے دلوں پر نہ پڑتا۔ کبھی یہ کوڑے برسا کر جسم پر ادھیاں ڈال دیتے۔ کبھی یاسر اور عمار کی داڑھی کھینچتے اور کبھی سمیہؓ کے بال پکڑ کر گھسیٹتے پھر سب مل کر زور سے قہقہہ لگاتے۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل نکل کر ان مظلوموں کے گرد جمع ہو جاتے اور ہر چہار طرف سے تماشا دیکھتے۔ ان قیدیوں کے دل تو بول رہے ہونگے۔ لیکن زبانیں بالکل خاموش تھیں۔ ان سب نے یہ طے کر لیا تھا کہ نہ زبان سے فریاد کرینگے نہ اپنی تکلیف کسی پر ظاہر ہونے دیں گے۔

یوں ہی گشت ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک جگہ ابوجہل اور اس کے ساتھ سارے تماشائی ٹھہر گئے۔ ابوجہل یاسر کے پاس آیا اور تمسخر کے لہجے میں پوچھا "تم نے کل کہا تھا کہ میں مخزوم کا حلیف ہوں۔ اب بتاؤ اُس حلف پر اب بھی قائم ہو؟"

"یہ ظلم کر کے تم نے ہمیں اس حلف سے خارج کر دیا اب اس کی ذمے داری
کا بوجھ ہمارے سر سے اتر چکا"۔

"پھر تو تم اب ہمارے حلف سے بری الذمہ ہو گئے نا"۔

"ہاں جس طرح شر اور منکرات سے بری ہو گیا ہوں مگر شریف آدمی ذلیل
نہیں کیا جا سکتا"۔

یہ سُن کر ابو جہل نے یاسر کے مُنہ پر اور تماشائیوں نے عمار اور سمیہ کے مُنہ
پر مار مار کر سب کو لہو لہان کر دیا۔ اس کے بعد ابو جہل نے اشارہ کیا اور لوگوں نے
قیدیوں کو زمین پر گرا دیا۔ پھر اشارہ کیا اور ان سب کے پہلو اور سینے داغے
گئے پھر اس نے حکم دیا اور ان کے سینوں پر بھاری بھاری پتھر رکھ دئیے گئے۔
اس کے کہنے کے مطابق ان کے چہرے پر مشکیزے بھر بھر کے انڈیلے گئے۔
ابو جہل یہ سب کچھ کراتا رہا اور آگ بگولا بنا ہوا منتظر رہا کہ ان بے بسوں کے
منہ سے کوئی فریاد کوئی چیخ کوئی آہ نکلے لیکن یہاں یہ حال تھا کہ ان کے دل
ایک دوسرے سے سرگوشیاں بھی کر رہے تھے اور ایک دوسرے کا درد سمجھ
رہے تھے مگر اپنی زبان کو بند کئے صبر و شکر کے ساتھ اپنے دل کو اللہ کی طرف
متوجہ کئے ہوئے تھے۔ اور اپنے جسموں کو قوم کے حوالے کر دیا تھا کہ جو چاہیں
کر لیں۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی ان تینوں کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کرتے
رہے اور خود ہار تھک کے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ان مظلوموں کو
چند نگرانوں کے سپرد کر دیا کہ وہ ان کی اسی حالت میں نگرانی کرتے رہیں تاآنکہ
وہ پھر غروب آفتاب سے پہلے پہلے واپس لوٹ کر آئیں۔

(۸)

حرب بن اُمیہ نے عبداللہ بن جدعان سے کہا :

"تمہارا یہ رومی غلام بڑا ذہین اور ہوشیار ہے۔ ایسی تجارتی سوجھ رکھتا ہے اور اپنی پونجی کو ترقی دینے میں ایسا کمال رکھتا ہے کہ میں نے تو ا آدمی نہیں دیکھا ہے۔"

"بات تو تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ بقو خود عربی النسل ہے جسے رومیوں نے فارس پر چڑھائی کرتے ہوئے بچپنے گرفتار کر لیا تھا یا رومی النسل ہے جس کو عربوں نے گرفتار کیا تھا جب کہ انھ نے اہلِ فارس کے ساتھ مل کر روم پر غارت گری کی جیسا کہ بنی کلب نے مجھے شام میں میرے ہاتھ اسے فروخت کرتے وقت بیان کیا تھا۔"

"اس کے رنگ میں ایک ایسی سُرخی ہے جو عربوں میں نہیں ہوتی اس کا لب ولہجہ بھی کسی قدر رومی انداز کا ہے۔ میں شام کے اکثر لوگوں سے لب ولہجہ سنتا رہا ہوں۔ بہر کیف اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ رومی ہے یا عر مگر یہ ضرور ہے میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جس میں ایسی ذہانت ایسا ہو گوش، ایسی تجارتی سوجھ بوجھ اور اپنی پونجی کو بڑھانے کی ایسی صلاحیت مو ہو۔ میں نے تو یمن کے سفر کے وقت اور پھر حبشہ کے بحری سفر کے موقعے بھی ایسا محسوس کیا جیسے یہ آدمی نہیں جنّ ہے جو منافعے کے مواقع اور کاروب کی منڈیوں کی بُو سونگھ لیتا ہے اور سولہ آنے صحیح بتا دیتا ہے کہ اگر ہم فلاں جائیں یا فلاں بستی میں ٹھہریں تو بے نظیر خرید، لاجواب فروخت ہو گی۔ میا

سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ نجاشی کے ملک میں اس نے منافعے کی خوشبو کس طرح
سونگھ لی۔ وہ سیدھا ایسے آدمیوں کے پاس گیا جو ہماری زبان اچھی طرح
بول سکتے تھے بلکہ آپس میں معاملے کی بات رومی زبان میں کرتے تھے۔
ان جاکران سے اتنا مال خرید لیا کہ نہ اسے خریدنے کی ہم ہمّت کر سکتے
تھے اور نہ اسے اُٹھانے کی ہم میں سکت تھی۔ پھر اس نے ایسی تدبیر کی، کہ
وہاں نے ہم سب لوگوں کو ریگستان میں تیرنے والے اونٹوں کی بجائے سمندر
میں تیرنے والی کشتیوں پر ٹکّے لے آیا۔ اور عجیب وغریب کمال تو یہ کیا کہ ان
تاجروں کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو آسانی سے یہ
کر سکتے ہیں کہ اپنے کچھ آدمی ساتھ ہی کشتیوں میں بھیج دیں تاکہ ہمارے ملک میں
پہنچنے کے بعد جس جس مال کی ضرورت محسوس کریں اسے خرید کر کشتیوں کو بھرلیں
تاکہ وہاں سے کشتیاں خالی نہ واپس ہوں۔ اس طرح اس نے ہمیں تجارت
کے ایک ہی موسم میں دو بلکہ زیادہ سفر کرنے سے بچالیا۔ میں نے کسی غلام میں
کوئی خاص قابلِ تعریف ذھانت تو دیکھی نہیں تھی اس لئے میں اس غلام کو
خریدتے وقت بھی کچھ زیادہ خوش نہ تھا مگر اس میں تو ہمیشہ خیر و برکت ہی
دیکھی۔"

اسی روز شام کو عبداللہ بن جدعان اپنے اس غلام سے جو یا تو رومی
تھا جسے عربوں نے قیدی بنالیا تھا یا عربی تھا جسے رومیوں نے گرفتار کیا تھا
تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے بولا:
"صہیب! اب کے تم یمن اور حبشہ کے سفر میں بڑی عمدگی کے ساتھ
تمام آزمائشوں کے دور سے نکلے۔ اگر حرب بن امیہ تمہاری تعریف نہ بھی کرتا

تو یہ کثیر منافع جو تم میرے پاس لے کر آئے ہو وہی تمہاری تعریف کے لئے کا
تھا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں پہلے سے کوئی تجارتی تجربہ حاصل تھا۔"
"توبہ کیجئے۔ میں نے تو اس سفر سے پہلے آج تک کبھی کوئی خرید و فرو
کا کام ہی نہیں کیا۔ بس زیادہ سے زیادہ ضروریاتِ زندگی کی وہ عام چیز
خریدتا رہا ہوں جو ہر روز لوگ خریدا کرتے ہیں۔"
"پھر تو یہ تمہاری فطری صلاحیت ہی ہو سکتی ہے!"
"ممکن ہے"
عبداللہ بن جدعان دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا اور صہیب نے و
سے ہٹنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کے مالک نے اشارے سے اسے ٹھہرا لیا۔ و
دیر تک کھڑا انتظار کرتا رہا کہ اس کا مالک اپنا چہرہ اس کی طرف اٹھا کر اس
کوئی بات کرے مگر وہ بدستور سر جھکائے رہا، یہاں تک کہ یہ غلام اُکتا گیا۔ یا اُکتا
لگا تھا کہ عبداللہ بن جدعان نے اپنا سر اٹھایا۔ غلام کی طرف مسکرا کر دیکھا ا
بڑی سنجیدگی سے پوچھا:
"صہیب کیا تم اس غلامی سے کبیدہ خاطر ہو۔"
"کون ہے جو غلامی سے نالاں اور آزادی کا خواہاں نہ ہو۔"
"تو میں چاہتا ہوں کہ تمہاری آزادی تمہیں واپس کر کے تمہیں خود مختا
بنا دوں، مگر ایک خطرناک آزمائش میں ڈالنے کے بعد۔"
"تو پھر یہ آزادی جو آپ مجھے عطا فرمانا چاہتے ہیں اپنے پاس ہی رکھ
کیونکہ آزادی خرید و فروخت کی چیز ہی نہیں۔"
"ارے واہ صہیب! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تمہیں بنی کلب سے خریدا
ہے اور انہوں نے تمہیں رومیوں سے یا عربوں سے خریدا تھا۔"

آپ نے یا بنی کلب نے مجھے خود مجھ سے تو نہیں خریدا۔ یہ تو دشمنوں نے مجھ پر چھاپا مارا اور مجھے بنی کلب کے ہاتھ بیچ دیا۔ پھر بنی کلب نے آپ کے ہاتھ فروخت کر دیا لیکن یہ میری منظوری یا پسند کے بغیر ہی ہوا۔ میری پسند اور میرے اختیار سے تو نہیں ہوا۔ آپ لوگ مجھے غلام سمجھتے ہیں لیکن میں تو اپنے آپ کو آزاد ہی سمجھتا ہوں۔ آپ لوگوں نے اپنی زبردستی سے دولت اور اقتدار کے زور سے میرے جسم پر اپنا قبضہ تو قائم رکھا ہے لیکن میرے دل پر کسی کا کوئی قابو نہیں۔"

"تو یہ غلام لوگ جو رقموں یا خدمتوں کے ذریعے لکھا پڑھی کر کے اپنی آزادی خریدتے ہیں اس کا کوئی مطلب ہی نہیں۔"

"وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کو تو وہی جانیں مگر میں کسی مکاتبت کے لئے بالکل تیار نہیں اور نہ کبھی کسی رقم یا خدمت کے عوض اپنی آزادی خریدوں گا۔ میں اپنے آپ کو ہمیشہ آزاد ہی تصوّر کرتا ہوں۔"

"سچ کہا تھا حرب بن اُمیہ نے کہ تم بڑے ذہین اور باہمت آدمی ہو۔ تاہم میں یہ چاہتا ہوں کہ ......"

"آپ یہ چاہتے ہیں کہ مجھے امتحان میں ڈالیں کیونکہ آپ کو مجھ پر جو تسلّط حاصل ہے اس کی وجہ سے آپ یہ جائز سمجھتے ہیں کہ جس طرح کی مشقّت میں بھی آپ چاہیں مجھے ڈال دیں۔ اچھا تو یہی سہی آپ مجھے جو کچھ فرمانا چاہیں فرما دیجئے۔ آپ مجھے اپنی تمنّا کے مطابق ہی پائیں گے۔ لیکن مہربانی فرما کر مجھ سے وعدے وعید نہ کیجئے اس لئے کہ مجھے کسی چیز سے اتنی نفرت نہیں جتنی جھوٹی آزادی اور غلط وعدوں سے ہے۔"

عبداللہ ابنِ جدعان نے اپنے جملے کو پورا کرنے کے لئے پھر آغازِ گفتگو کا

ارادہ کیا لیکن صہیب اس کا موقع دینے سے پہلے ہی جھٹ بول اُٹھا:

"کیا میں خود آپ کے اس بوجھ کو ہلکا کر دوں جو آپ کے لئے پریشان کُن بنا ہوا ہے؟ اگر آپ کہیں تو واضح لفظوں میں وہ بات میں ہی عرض کر دوں جو آپ کے دل میں موجود ہے مگر زبان پر نہیں آ رہی ہے۔"

"ارے تو کیا تم دلوں کا راز بھی جاننے لگے ہو۔"

"میں یمن اور حبشہ کے سفر میں بہت کامیاب رہا اور آپ کو بہت سا منافع بھی لا کر دیا۔ لہٰذا اب آپ کی تمنّا یہ ہے کہ آپ مجھے تجارت کے لئے شام اور روم کی طرف بھی روانہ کریں۔ آپ کا خیال ہے کہ جتنا منافع میں نے اس سرمائی سفر میں حاصل کیا ہے اس سے زیادہ اس سفر شام و روم میں حاصل کر لوں گا۔ آپ کو اپنے مالِ تجارت اور منافعے کے متعلق تو مجھ پر پورا اطمینان ہے کہ کوئی آنچ نہیں آئے گی، لیکن آپ کو خود میری ذات یا میرے دل کے متعلق اطمینان نہیں۔ آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں روم میں آزاد پیدا ہوا اور آزاد رہا اور یہ عین ممکن ہے کہ جب میں اس سرزمین میں پہنچوں تو وہیں رہ جاؤں اور آپ کے پاس واپس نہ آؤں بلکہ شاید آپ کا مال اور منافعے کی امانت بھی روک لوں۔"

"تمہاری گفتگو کا یہ آخری حصّہ صحیح نہیں۔ مال و منافع کے متعلق تم میری نظروں میں امانت دار ہی ہو۔"

"کیا آپ مجھے اپنے مال کا ایک حصّہ نہیں سمجھتے؟ پھر مجھ پر خود میری ذات کے بارے میں بھی اس طرح کیوں بھروسا نہیں کرتے جس طرح میرے سپرد کئے جانے والے مال پر کرتے ہیں۔ بس آپ اپنے دل کو اس طرف سے مطمئن کر کے روما میں تجارت کرنے کی تیاری شروع کر دیجئے۔ میں آپ سے رخصت ہو کر جاؤں گا اور اتنا کچھ مال اور نفع لے کر لوٹوں گا جو آپ نے پہلے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ اہلِ

روم کس چیز کو پسند اور کس کو ناپسند کرتے ہیں، اسے میں سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ یاد رکھئے کہ نہ تو روم میں میرا کوئی گوہرِ مقصود ہے نہ وہاں رہنے میں میری کوئی دلچسپی ہے۔ مجھے اپنے بچپنے کے آخری اور جوانی کے ابتدائی زمانہ سے یہ یقین ہے کہ روم میں میرا کوئی گھر نہ ہوگا۔ مجھے اس زمانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی اس بستی (مکے) میں میرا ایک گوہرِ مراد ہے۔ معلوم نہیں کونسا گوہرِ مراد۔ یہ بات نہ ہوتی تو نہ میں آپ کے ساتھ رہتا اور نہ کبھی آپ کی آقائی کو تسلیم کرتا۔ مجھ جیسے آدمی کے لئے آپ لوگوں کو چھوڑ کر کہیں اور چل دینا معمولی بات تھی۔ آپ لوگ نہ نگران ہیں نہ پولیس۔ اگر میں چاہتا تو آپ سب کو فریب دے کر اس حرم سے صاف نکل جاتا اور آپ لوگ اپنے امکان بھر ڈھونڈھنے کے باوجود مجھے ہرگز نہ پا سکتے اور اگر پا بھی لیتے تو مجھ پر قابو تو کبھی نہ پا سکتے۔"

"ہماری اس بستی میں تمہارا وہ نامعلوم گوہرِ مقصود کیا ہے؟ ذرا ہم بھی تو سُنیں۔"

"اس کا علم مجھے ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔ لیکن بچپنے کے اختتام اور جوانی کے آغاز کے دنوں میں صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ میری زندگی اور موت تمہاری اس سرزمین پر ہوگی۔ آپ کے اس حرم میں عمر کا ایک حصّہ بسر کروں گا اس کے بعد بقیہ زندگی ایک دوسرے حرم میں گزاروں گا اور میری موت اور میری قبر حجاز ہی میں ہوگی۔"

"ارے صہیب! تم تو آج کچھ عجیب انوکھی سی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تو یہ علم نہیں کہ سرزمینِ عرب میں اس حرم کے سوا دوسرا اور کون سا حرم ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی علم نہیں کہ عرب میں اس حرم کے سوا کوئی اور حرم بھی ہے لیکن میں تو صرف وہ کچھ بیان کر رہا ہوں جس کی مجھے اس وقت خبر دی گئی ہے جب کہ

میرے بچپنے کا زمانہ ختم ہو کر جوانی شروع ہونے والی تھی۔ یہ بات میں نے ایک قسیس (راہب یا کاہن) سے روما میں سنی ہے۔ میں نے اس پر پوری طرح غور نہیں کیا۔ اور نہ کوئی خاص توجہ کی ہے لیکن میں نے جب ایک دن اپنے آپ کو بنی کلب کے ہاتھ فروخت ہوتے ہوئے پایا تو ان مالکوں کو آپس میں بولتے سنا کہ جب قریشی ساکنان حرم کے قافلے ادھر آئیں گے تو ان کے ہاتھ اچھے داموں پر اسے فروخت کر دیا جائے گا۔ میں اس وقت اگر بنی کلب کے قبضے سے نکل بھاگنا چاہتا تو میرے لئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی لیکن میں نے یہ سوچا کہ اس قسیس نے جو باتیں کہی ہیں ان کی صداقت کا امتحان ہی کر لیا جائے۔ سو اب تک تو اس کی تمام باتیں سچی ثابت ہوئی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس کی بقیہ باتیں بھی اخیر تک سچی ہی نکلیں گی۔ بہرکیف آپ مجھے تجارت کے لئے جہاں بھی بھیجنا چاہتے ہوں بشوق بھیجئے۔ میں بہرحال آپ کا خیر خواہ بھی رہوں گا اور لوٹ کر آ بھی جاؤں گا۔ اور اگر آپ مجھے آزاد کرنا چاہتے ہوں تو ابھی اور اسی وقت آزاد کر دیجئے۔ مجھے تو آپ کی سرزمین میں رہنا ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں جاؤنگا آپ مجھے صبح ہوتے ہی یہاں سے باہر نکال کر دیکھ لیجئے۔ میں شام تک پھر لوٹ کر آ ؤں گا اور اس وقت تک یہیں رہوں گا جب تک ہونے والی بات یقینی طور پر ہو کر نہ رہے۔"

"اس طرح زندگی کی بازی لگانے والا تو میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے۔"

"یونہی سہی۔"

"اچھا تو تم میرے ساتھ مسجد (بیت الحرام) تک چلو تاکہ میں قریش کو گواہ بنا کر ابھی تمہیں آزاد کر دوں۔"

"آپ کا خود اپنے آپ کو اور مجھے گواہ بنا لینا میرے لئے کافی ہے۔ اپنی آزادی
لئے مجھے اور کسی کی گواہی کی ضرورت نہیں"
صبح ہوگئی تو عبداللہ بن جدعان قریش کے حلقوں میں گیا اور ان کو بتایا
اپنے رومی غلام صہیب کو میں نے آزاد کر کے اپنا حلیف بنا لیا اور اپنی تمام
لت کا امین بھی بنا دیا ہے اور اس مال تجارت کا بھی جو سردی و گرمی کے سفروں
ساتھ جائے گا۔ قریش نے یہ سن کر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ یہ
وان اپنے آقا کی تجارت کے فروغ میں جس عمدگی سے محنت کرتا رہا تھا اس کا
کرہ حرب بن امیہ قریش سے کر چکا تھا۔

صہیب نے اپنی جوانی کا بہترین حصہ عبداللہ بن جدعان کی تجارت
فروغ دینے میں گزار دیا۔ صہیب اس کی دولت کو ترقی دیتے رہے اور تجارت
پھیلاتے رہے۔ وہ مالِ تجارت لے کر کبھی نجاشی کے ملک میں جاتے۔ کبھی
صر کی مملکت میں اور کبھی کسریٰ کی سلطنت میں۔ آخر کار عبداللہ بن جدعان
ام قریش میں سب سے بڑا مالدار ہوگیا اور جود و سخا میں بھی سب سے آگے بڑھ گیا حتیٰ کہ شعراء
ی بڑی بڑی رقموں کے عوض اپنے مدحیہ اشعار اس کے ہاتھ فروخت کرنے لگے۔ عبداللہ
ن جدعان جب لوگوں سے تعریفی کلمات سُن کر خوش ہوتا تو صہیب سے کہتا:
"ان تمام تعریفوں کے آدھے حصے کا حق تمہیں پہنچتا ہے۔ کیونکہ اس کے
سائل و اسباب میرے لئے تم ہی نے مہیا کئے ہیں"
عبداللہ بن جدعان کبھی کبھی صہیب سے دریافت کرتا:
"اس سرزمین میں تمہارا گوہرِ مراد کیا ہمیشہ باقی رہے گا آخر وہ ہے کیا؟"
"خدا جانے کیا ہے"

"صہیب! کیا وہ گوہرِ مراد اب تک تم پر بے نقاب نہیں ہوا؟"

"ہو جاتا تو میں آپ سے تو پوشیدہ نہ رکھتا۔"

ایک دن موت نے عبداللہ بن جدعان کو آلیا اور صہیب اب آزاد تھے۔ ان کے پاس بہت مال تھا۔ ان کے لئے کوئی دشواری حائل نہ تھی چاہتے تو روم چلے جاتے، جہاں انہوں نے نشو و نما پائی تھی یا کسریٰ کے عراقی حصے میں منتقل ہو جاتے جہاں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن وہ مکے ہی میں رہے۔ وہاں سے کھسکنے کا نام بھی نہ لیا۔ وہیں وہ اپنی دولت کو ترقی دیتے لیکن اعتدال کے ساتھ۔ نہ تجارت میں انہماک پیدا کیا اور نہ کہیں دور در میں گئے۔ عبداللہ بن جدعان کے روش کو زندہ رکھتے ہوئے بھوکوں کو کھلاتے، غریبوں کی مالی امداد کرتے اور محتاجوں کی حاجت روائی کرتے ان سے مطمئن تھے۔ اور ان پر بھروسا کرتے تھے۔ اور ان کی اس خاص سے جس کی وضاحت سے وہ خود ہی ناواقف تھے دلچسپی لیتے تھے۔

ایک دن صبح صہیب نے قریش کے حلقوں میں دار ا متعلق اور کچھ اُن لوگوں کے متعلق جو وہاں محمد بن عبداللہ کے گرد جمع تھے کچھ باتیں کرتے سنا۔ اور پھر یہ بھی سُنا کہ وہاں "قرآن" پڑھا جا اور خاص خاص گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ صہیب کے دل میں ایک گدگدی پیدا ہوئی کہ کہیں یہی وہ گوہرِ مقصود نہ ہو، جس کا تصوّر اختتامِ طفلی اور شباب سے شروع ہو کر اختتامِ شباب اور آغازِ کہولت تک ان کے دم ساتھ رہا ہے۔ اور اب ان سے آہستہ آہستہ قریب ہوتا جا رہا ہے۔ ان دارارقم کی طرف جانے کے معاملے میں ان سے بار بار الجھتا۔ وہ اسے رو

تھے۔اور ان کے اور روسائے قریش کے درمیان جو تعلقاتِ محبت باقی
ان کی وجہ سے وہ ادھر جانے سے ہچکچاتے۔ لیکن دارارقم کی طرف انکی
روز بروز تیز تر ہوتی گئی۔ دن کو جاگتے میں اور رات کو سوتے" میں ہر
یہ شوق ان پر طاری رہتا۔ آخر ایک دن ان کے دل نے یہ" ناخوشگوار"
کر ہی لیا۔ گھر سے مسجد کا ارادہ کر کے نکلے اور اپنی دُھن میں چلتے چلتے
پہنچنے کی بجائے اُنہوں نے اپنے آپ کو عین دارارقم کے سامنے پایا۔ اور
نے ہی ذرا فاصلے پر عمار بن یاسر کو دیکھا۔ پھر دونوں کے درمیان کچھ باتیں
۔ (جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) اس کے بعد دونوں اندر داخل ہوئے
پھر داخل اسلام ہو گئے۔ جب شام ہوئی تو سب چپکے سے نکلے۔

قریش نے اس دن صہیب کو کہیں نہ پایا۔ دوسرے دن بھی وہ غائب ہی
۔ تو ابوجہل ان کی تلاش میں نکلا۔ پھر ایک دن وہ غصّے میں بھرا ہُوا آیا۔ قریش
دیکھا تو ایک نے کہا کہ آج تو ابوالحکم (ابوجہل) کا جلال اپنے اوج پر معلوم
ہے۔ ابوجہل اپنی قوم کے حلقے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی کمان پر ٹیک
کر غضب آلود اور غیظ آور لہجے میں بولا:

"اے معشرِ قریش! سنتے ہو آج صہیب بھی صابی ہو گیا۔ اب اسے بھی
ندانِ یاسر کی سزاؤں میں شریک ہونا پڑے گا۔"

(۹)

بنی خثعم کو آج کی طرح کبھی یہ موقع ہی پیش نہ آیا تھا کہ وہ کسی ایسے دشمن
پر جس نے کبھی ان سے کوئی جنگ نہیں کی تھی قابو پائیں اور مال غنیمت سے
اپنا دامن آرزو بھر لیں۔ بنی خثعم کو نہ کوئی مشقت برداشت کرنی پڑی نہ
مصیبت اُٹھانی پڑی۔ نہ کسی جد و جہد کی نوبت آئی نہ کوئی چال چلنی
بس ہر شخص اپنے قریب کے مال و اسباب کی طرف بے تکلّف ہاتھ بڑھاتا۔
اپنی خواہش کے مطابق بلکہ اس سے زیادہ لے کر چل دیتا۔ یہ معلوم ہوتا
جیسے نجاشی کے مال و اسباب میں ایک لوٹ مچی ہوئی ہے اور خثعمیوں
اذنِ عام ہے کہ جی بھر کے اس میں سے جو چاہیں لے لیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے
نہ وہ کم پر خوش ہو سکتے تھے نہ کسی معمولی چیز پر قانع۔ ان کا بس چلتا تو
وہ سبھی کچھ سمیٹ لیتے۔ واقعات یوں ہوئے کہ ابرہہ کا لشکر شکست کھا کر
سے لوٹ رہا تھا وہ اپنی قوّت و شوکت کوئی جنگ کئے بغیر ہی کھو چکا تھا
اور اپنے کمانڈر کو بیماری کی حالت میں اُٹھائے لئے جا رہا تھا۔ کمانڈر
عجب حال تھا کبھی اس پر موت چھا جاتی اور شدید خوف و ہراس میں
ہوتا۔ کبھی زندگی کے کچھ آثار دکھائی دیتے تو قدرے اطمینان کی سانس
اس کی بیوی اس کی طرف ہمہ تن متوجہ اور بد حواس تھی۔ صبح کو پُر اُمید
تو شام کو مایوس ہو جاتی۔ لشکر کا وہ حصّہ جس کو موت نے چھوڑ رکھا تھا یا
بادِل پرندوں (طیراً ابابیل) کی یلغار سے بچ رہے تھے، بے یار و مدد
اور ذلیل و خوار ادھر سے اُدھر گرتے پڑتے بھاگ رہا تھا۔ لوگ اپنے بدن کا

زور لگا لگا کر اُٹھتے تھے مگر ان کی پنڈلیاں ان کو پوری طرح سنبھال نہ سکتی تھیں۔ ناامیدی اور مایوسی ان سے عجب کھیل کھیل رہی تھی۔ گویا وہ سائے تھے جن کو مال واسباب ہنکائے لئے جا رہا تھا۔ سائے بھی ایسے جو ڈراتے نہ ہوں بلکہ خود سہمے ہوئے ہوں۔

بنی خثعم نے جب ابرہہ کے لشکر کو مکّے کی طرف پوری حشمت اور شوکت ساز و سامان کے ساتھ خوش خوش جاتے دیکھا۔ تو ان میں جو شرفا اور سمجھدار تھے اُنہوں نے ابرہہ کے اس اقدام میں شریک ہونے سے (اپنی قوم کو) روکا تھا۔ وہ نہ تو ابرہہ کا مقابلہ ہی کرنا پسند کرتے تھے۔ نہ اپنے آپ کو اس کے ہاتھ بیچنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں ابرہہ ایک بڑے گناہ کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ بہرحال اس طبقے نے اپنے آپ کو الگ رکھا۔ لیکن جو بے وقوف، غصّے ور اور جلد باز تھے وہ مختلف گروہوں میں منقسم ہو کر پھیل گئے۔ کسی گروہ نے تو پورا مقابلہ کیا اور تھک ہار کر شکست مان لی۔ کسی نے اس گناہ کو بہت معمولی سمجھ کر اس کے نتائج سے بے پروائی برتی اور اپنی مناسب قیمت لگا کر سودا کر ڈالا۔ بعض ایسے بھی تھے جو ابرہہ کا براہِ راست مقابلہ کرنے کے لئے سامنے آئے ہی نہیں بلکہ گھات میں لگے رہے۔ انتظار کرتے رہے کہ ابرہہ کے لشکر پر کوئی مصیبت آئے تو اس کی بدحواسی سے فائدہ اُٹھا کر اِدھر اُدھر قتل و غارت کریں۔ چھاپہ ماریں اور پہاڑ کی چوٹیوں اور گھاٹیوں میں چُھپ جائیں ابرہہ اپنے غصّے کو اپنے دل میں دبائے رہا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ مکّے سے واپسی میں ان کو ایسا سبق دیا جائے گا کہ عربوں کے بھی کان ہو جائیں گے۔ اور نجاشی کی ہیبت و سلطنت کا لوگوں کو پتہ چل جائے گا۔ لیکن ابرہہ نہ مکّے میں داخل ہو سکا نہ بیت اللہ کو کوئی نقصان پہنچا سکا۔ وہ مکّے سے لوٹا

توفاتح ومنصور کی حیثیت نہ تھی۔ وہ ایک ایسے شکست خوردہ نا منصور کی حیثیت سے بھاگا۔ جسے خود حالات نے کچھ کا کچھ کر دیا تھا۔ اس کو تو نہ کوئی جنگ کرنے والا لشکر ہی ملا۔ نہ اس نے مقابلہ کرنے والا دشمن ہی دیکھا۔ پرندوں کے جھنڈ البتہ دیکھے جنہوں نے پتھراؤ کر کے اس کے لشکر کا بھونسا اُڑا دیا۔ قیمہ کر دیا۔ ابرہہ کے مقربین تو تیزی سے یمن کی طرف بھاگ نکلے۔ مگر ایسے بیمار ہو کر، کہ موت کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ بھاگتے وقت راستے میں بنی خشعم ملے تو سہی مگر بجائے اس کے کہ وہ خشعم کی دھر پکڑ کرتے۔ ان کی سزا کرتے۔ جوشِ انتقام کا نشانہ بناتے۔ اُلٹا خشعم ہی ان پر جھپٹ پڑے۔ اور سزا کا مزا چکھلنے لگے۔ یہ لوگ خشعم سے اپنی جان مشکل ہی سے بچا سکے۔ اور اپنے مریض کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر کے روانہ ہو گئے۔ لیکن ابھی صنعاء تک بھی نہ پہنچے تھے۔ کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور مسلسل تکلیف مرض کے بعد موت نے اسے آلیا۔

خشعم نے نجاشی کے مال ومتاع پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ سونا۔ چاندی۔ اونٹ۔ گھوڑے اور جو مال واسباب ان پر لدا ہوا تھا لوٹ کر خوب دولت حاصل کی۔ حاصل کردہ غنیمت میں حبشہ کی وہ حسین اور شریف نوجوان عورتیں بھی تھیں جو لشکر کے ساتھ ساتھ تھیں۔ یہ لوگ عیش وعشرت کے مزے لوٹتے اور سیر وتفریح کی لذّت سے بہرہ اندوز ہوتے ہوئے بڑھتے چڑھتے چلے آئے تھے۔ ان عورتوں کے ساتھ ان کے بزرگ اور شوہر بھی تھے۔ جن سے ان کے دلوں کو لطف وسکون حاصل تھا۔ اور خود یہ لوگ بھی ان حسین عورتوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے سرور میں تھے۔ ان کا یہ سفر ایسا ہی تھا جسمیں نہ انہیں کوئی مشقت جھیلنی تھی نہ کوئی جدوجہد کرنی تھی۔ مقصد تو صرف اپنے

دل کو تسکین دینے اور غم کو دور کرنے کے لئے ایک جاہل۔ درشت اور جنگلی قوم کو سبق دینا تھا اس گھر کو ڈھانا تھا جسے یہ لوگ بہت بڑی چیز سمجھ کر وہاں جمے ہوئے تھے۔ اور یہ سمجھتے کہ بس یہی ایک گھر مستحق تعظیم اور حق دار تقدیس ہے۔

ایسے معمولی اور لذّت بخش سفر کے لئے تھا بھی یہ ضروری کہ مرد اپنی لذّتِ جسمانی، فرحتِ قلبی اور خنکی چشم کے سارے ہی سامان اپنے ساتھ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ لشکر کے قائدین و امراء نے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو بھی ساتھ رکھ لیا تھا جنہوں نے اپنی محبّت و شفقت اور نرمی و لطافت سے ان کو مسرور اور مگن کر رکھا تھا۔ مزید برآں اُنہوں نے گانے بجانے اور ناچنے والی لونڈیاں بھی ساتھ رکھ لی تھیں جو لطفِ سفر کو دوبالا کر رہی تھیں۔ ان کے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ ان آزاد عورتوں اور لونڈیوں کو اس لئے ساتھ لئے جا رہے ہیں کہ انہیں ان سخت مزاج عربوں کے لئے لوٹ کا مال بننے کے لئے چھوڑ بھاگیں گے جو یا تو کعبے کے قریب رہتے ہیں یا دور سے وہاں آتے ہیں۔

سحیم بن سہیل خثعمی بھی اپنے نبرد آزماؤں کے ساتھ نکلا۔ اور دشمنوں سے لڑ بھڑ اس نے بھی اپنے بھائیوں کی طرح اپنا دامن سونے چاندی اور مال و اسباب سے بھر لیا۔ لیکن اس کی نظر ایک ایسی اونٹنی پر پڑی جسے ایک بدہئیت بھدا حبشی کھینچے لئے جا رہا تھا۔ یوں تو وہ خاصا بہادر جنگجو معلوم ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ ایسا بے کس، بے یار و مددگار ہو رہا تھا جسے محنت و مشقت اور بیماری نے توڑ رکھا ہو۔ بس وہ اپنے آقاؤں کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ ورنہ اگر ذرا سی اپنی خواہش پر چلتا تو سڑک کے کسی کنارے ہی آرام کرنے بیٹھ

جاتا۔ اس اونٹنی کو آزاد چھوڑ دیتا کہ جہاں اس کا دل چاہے یا قضا و قدر لے جانا چاہے وہاں چلی جائے۔ اس اونٹنی پر ایک نفیس ہودہ تھا جس پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ سونے اور جواہر سے مرصع۔ سحیم اسے دیکھ کر حیرت میں آگیا۔ اور دیوانہ ہوگیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں نیزہ ہلاتا ہوا تیزی سے اس حبشی کے پاس آیا۔ غلام نے اسے دیکھتے ہی اونٹنی کی مہار اس کی طرف موڑ دی۔ اور اس کے آگے نہایت فرمانبردارانہ و خردمندانہ انداز سے چلنے لگا۔ سحیم بن سہیل نے اس غلام سے پوچھا کہ یہ ناقہ کس کا ہے اور اس ہودے میں کون ہے۔ غلام نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جواب دیا۔ یہ کمانڈر کی بھانجی ہے۔ سحیم بن سہیل نے غلام اور ناقے کو اپنے گھر کی طرف ہانکتے ہوئے اپنے دل میں کہا یہ غلام، یہ ناقہ اور یہ قیمتی سامان جو اس پر لدا ہوا ہے وہ میرے لئے کافی غنیمت ہے۔ رہی یہ ملکہ تو نہ اسے میری ضرورت ہے نہ مجھے اس کی اسے تو میں کسی قریشی سردار کو تحفے میں پیش کروں گا۔

آگے آگے غلام ناقے کی مہار تھامے چلتا اور پیچھے سہیم۔ آخر محلے کی آبادی کے پاس پہنچ کر اس نے غلام کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ناقے کو بٹھایا۔ سحیم ذرا دیر کے لئے زمین کی طرف نظریں جھکا کے اس طرح غور کرنے لگا جیسے وہ زمین کے اندر کوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔ پھر اس نے غلام کو اشارے سے کہا کہ ہودے کو نیچے اُتار کر رکھ دے۔ اس کے بعد وہ ایک طرف ہوگیا۔ اور ذرا دیر کے لئے پھر زمین کی طرف دیکھ کر اس طرح غور کرنے لگا جیسے وہ کچھ ڈھونڈھ رہا ہو۔ پھر وہ ہودے کی طرف دھیرے سے بڑھا اور نہایت نرمی اور آہستگی سے ہودے کا ایک پردہ اُٹھا کر ہودے کے اندر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ وہ دل ہی دل میں بولا کہ رب کعبہ کی قسم

تو ایک حیرت انگیز حسین کبوتری[1] ہے"۔ اس نے ہودے کے اندر ایک ایسی نوجوان عورت دیکھی جس کی گندم گوں جِلد پر حسن جھلک رہا تھا۔ جمال چمک رہا تھا۔ نگاہیں فتنہ مجسم تھیں۔ قد نہ بہت لمبا نہ بہت پست۔ وہ کمزور اور نحیف ہو رہی تھی۔ دہشت اور خوف بھی اس پر طاری تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ بڑے صبر و سکون سے بیٹھی تھی۔ اس کی حیا اور وقار اسے اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ اپنی گھبراہٹ دہشت۔ بے چینی اور حیرت و خوف کو ظاہر ہونے دے جس سے اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ سحیم بن سہیل اپنی نظریں اس پر ڈالتا اور لوٹا لیتا اور خوشی سے اس کا چہرہ دمک اُٹھتا۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ رب کعبہ کی قسم یہ تو ایک حیرت انگیز حسینۂ عالم ہے۔ اس کے بعد اس نے اس نوجوان عورت کو بہت نرمی اور شرافت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے ہودے سے باہر نکالا کہ بیٹی گھبرانے اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں تیرے ساتھ کسی بُرائی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میری طرف سے ایسی کوئی حرکت نہ ہوگی جسے تو ناپسند کرتی ہو۔ پھر اس کو ہاتھ کا سہارا دے کر آہستہ آہستہ لے چلا۔ لڑکی اس کے حکم پر چل رہی تھی۔ اس کے لئے اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ وہ اسے لے کر اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس سے پُر وقار زوردار لہجے میں کہا کہ ذرا ان صاحبزادی کا پورا خیال رہے کسی خثعمی کا گھر ان کے لائق نہیں۔ یہ کسی قریشی سردار ہی کے لائق ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ہودے، ناقے اور غلام کو بڑی حفاظت سے رکھا اور لوٹ میں اپنے بھائیوں کی شرکت کیلئے پھر دوڑا کہ شاید اس سے بھی زیادہ کچھ مالِ غنیمت اور ہاتھ لگے۔

ابھی مہینہ بھی پورا نہ ہُوا تھا کہ سحیم بن سہیل   ایک گاؤں میں خلف بن وہب

---

[1] حمامہ کا ترجمہ ہم نے کبوتری کیا ہے لیکن اس کے معنی حسین عورت کے بھی ہیں۔

جمحی کے پاس پہنچا۔ یہ حبشی امیرزادی بھی اس کے ساتھ تھی۔ جب خلف کے پاس اس نے اپنی اونٹنی بٹھائی تو صاحب خانہ نے عربوں یا قریشیو عادت کے مطابق اپنے مہمان کا استقبال کیا۔ ابھی علیک سلیک کی رسم بھی نہ ہوئی تھی کہ سحیم بولا:

"سردار جمحی! کاش آپ کو یہ علم ہوتا کہ میں آپ کے لئے کیا تحفہ لایا ہو

"کوئی اچھی چیز ہی لائے ہوگے۔ اس سے پہلے بھی تم ہمیشہ اچھا لایا کرتے ہو۔"

"اجی میں آپ کے لئے امیر ابرہہ کی بھانجی کو لایا ہوں۔ وہی کم بیت اللہ پر حملہ کرنے آیا تھا اور "گھر والے" نے اسے بے بس اور رسوا پسپا کر دیا۔"

"کیا یہ ابرہہ کی بھانجی ہے؟"

"جی ہاں ابرہہ کی بھانجی ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"نام تو معلوم نہیں۔ البتہ اس کا چھریرا خوبصورت جسم دیکھ کر میں اس کا نام حمامہ رکھ دیا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی خثعمی تو اس نہیں بلکہ کوئی عام عربی بھی اس کا اہل نہیں بجز کسی قریشی سردار کے۔ بیت اللہ کے محافظ اور خداؤں کے خدّام ہیں۔ پھر آپ کو اس دوستی محبت کا بھی علم ہے جو میرے اور آپ کے درمیان قدیم زمانے سے چل ہے۔"

خلف نے اس لڑکی کی قیمت دریافت کرنی چاہی لیکن سحیم بات بولا:

"ذرا ٹھہرو ابو اُمیہ! میں تمہارے پاس اس امیرزادی کو تاجرانہ حیثیت نہیں لایا ہوں بلکہ یہ میری طرف سے ایک ایسا تحفہ ہے جو ایک دوست دوست کے لئے لاتا ہے۔"

"تمہارا صلہ رحمی قائم رہے۔"

یہ کہہ کر خلف نے شکر گزارانہ خوشی کا اظہار کیا اور اپنے دل کی گہرائیوں یہ سوچا کہ ان بے چارے اعراب (دیہاتیوں) کے تحفے قبول کر کے ان کا صلہ بھی دینا چاہیئے۔ اس نے امیرزادی کو اشارہ کیا اور وہ اس کی بیوی کے اندر چلی گئی۔ خلف نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں بلکہ دیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔ اس کے بعد جس طرح میزبان اپنے مہمان سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ سیم سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا تو سیم کو یہ پیدا ہوا کہ شاید اس کے دوست کو یہ تحفہ اتنا پسند نہیں جس کی اسے توقع لتنے میں خلف نے سر اُٹھا کر کہا:

"سیم شاید تمہیں یہ علم نہیں کہ تم نے آج سے پہلے کبھی میرے ساتھ اتنی بڑی نہیں کی تھی۔ ہم نے ابرہہ کا مقابلہ نہیں کیا نہ بیت اللہ کی حفاظت کی۔ تو یہ حکم دیا گیا کہ ہم منتشر ہو جائیں اور بیت اللہ کی حفاظت خود ربّ بیت کے سپرد کر کے الگ ہو جائیں۔ چنانچہ اس گھر کی حفاظت خود گھر والے کی۔ اور ابرہہ کو مع اس کے ہاتھی اور حبشی فوج کے خود مار بھگایا جس کا تماشا پہاڑ کی چوٹیوں سے اور گھاٹی کے ان راستوں سے دیکھ رہے تھے جہاں ہم منتشر ہو ہو کر چھپے پڑے تھے۔ اور جب دشمن بھاگ کھڑا ہوا تب ہم لوگ کی طرف روانہ ہوئے اور اپنے گھروں کو لوٹے۔ اس وقت ہم میں سے وں کے دل میں حسرتیں چٹکیاں لے رہی تھیں۔ کیونکہ اس گھر کی مدافعت

اور حفاظت کی جو ذمے داری ہم پر عائد تھی وہ ہم نے ادا نہ کی تھی۔ لہٰذا اب جو تم اس امیرزادی کو میرے پاس لائے ہو تو گویا تم نے میرے دل کو تسکین دینے کا ایک موقع بہم پہنچا دیا۔ اس گھر کی قسم جس کی ہم نے کوئی حفاظت نہیں کی، میں تمہاری اس حبشی امیرزادی کو ایسا ذلیل و خوار کروں گا کہ اس کے خواب و خیال بھی نہ آیا ہو گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کبھی مکے میں داخل نہ ہو پائے گی۔ کیونکہ ارضِ حرم کے مالک نے اس ناپاکی کو اپنی زمین اور اپنے گھر سے خود ہی دفع کیا ہے۔"

"اوہ! غضب خدا کا۔ اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ آپ اس نازک اندام حسینہ کے ساتھ اس طرح کی بدسلوکی کریں گے تو میں اسے اپنے پاس ہی رکھ چھوڑتا۔"

(ہنس کر) "افسوس ہے یہ باتیں مقدر کی ہیں۔ اس کا انتظام خود اُس ہستی نے کیا ہے جو مجھ سے اور تم سے زیادہ قدرت والا ہے۔ اس امیرزادی کا اُسی حرم کے پاس ذلیل و رسوا کیا جانا ضروری ہے۔ جس حرم کو رسوا کرنے کا ارادہ اس کی قوم نے کیا تھا۔ جب تک میں زندہ ہوں یہ عورت نہ آزادی کا نام سُنے گی اور نہ اس کی اولاد آزاد ہو گی۔"

"تم اگر اس سے خوش نہیں ہو تو اسے مجھے واپس ہی کر دو۔"

(زوردار قہقہہ لگا کر) "میں تمہارے لئے اسے ناپسند نہیں کرتا۔ میں تو کہہ چکا کہ میں جب تک میں زندہ ہوں یہ آزاد اولاد نہیں پیدا کرے گی اس گاؤں میں میرے بہت سے اونٹ ہیں اور بکریاں جن کو میرے سیاہ و زرد فام غلام چرایا کرتے ہیں۔ بس یہ بھی انہیں کے ساتھ اونٹ اور بکری ہی چرائے گی۔"

سعیم نے اپنی بات دھرانی چاہی لیکن خلف نے گفتگو کا رُخ بدل دیا

اور یمن۔ تہامہ اور حجاز کی باتیں چھیڑ کر اس کی توجہ ہٹا دی۔

اس دن شب کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خلف اپنی بیوی ام امیہ کے پاس گیا۔ تو اسے بہت ہی غمگین و فکرمند پایا۔ خلف نے جب اس سے افسردگی کی وجہ دریافت کی تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں غمگین لہجے میں اتنا ضرور پوچھا "سحیم جو حبشی حسینہ تمہارے پاس لایا ہے تم اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہتے ہو"

(اپنی بیوی کے غصّے کو ذرا چھیڑتے ہوئے) اُم امیہ! اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ یہ ہاتھی والے کمانڈر کی بھانجی ہے"

(بھرائی ہوئی آواز سے) "ہاں اب یہی رہ گیا ہے کہ جو لوگ ہمارے گھر پر چڑھائی کریں۔ ارض حرم کی بے حرمتی اور بیت اللہ کو ڈھانے کا ارادہ کریں ان کے ساتھ ہم نرمی کا برتاؤ کریں"

خلف یہ سُن کر بیوی کے قریب آیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"نہیں اُم امیہ! گھبراؤ نہیں۔ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ اس لڑکی نے اپنی زندگی میں آج تک ہمیشہ عزّت و احترام ہی کے دن دیکھے ہیں۔ لیکن جب سحیم نے لا کر اسے تحفے میں دیا تو میں نے قسم کھالی کہ آج سے اسے صرف ذلّت و خواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے حرم کی حمایت میں کسی آزمائش سے دو چار نہیں ہونا پڑا۔ اس لئے کم از کم اتنا تو ضرور ہی کرنا ہے کہ اس امیرزادی کو حبشہ کی تذلیل کا ذریعہ بناؤں"

"تو پھر اسے میری خادمہ بنا دو"

(ہنس کر) "ہے ہے تیری خدمت اس کے لئے کوئی ذلّت نہیں ام امیہ"

"تم اسے میری خادمہ بنا کر تو دیکھو کہ میں کس طرح اسے ذلّت کا مزہ چکھاتی

ہوں۔"

"اچھا تو اس شرط پر کہ تم "سرات" کے اس گاؤں میں رہو۔ نہ ارضِ حرم پر قدم رکھو نہ مکے میں داخل ہو۔ کیونکہ اس گھر کے مالک نے ان لوگوں کو حرم سے دھتکار دیا ہے اس لئے ہم اس کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتے، اور نہ اس لونڈی کے وجود سے ارضِ حرم کو ناپاک کروا سکتے ہیں۔ چاہے اس کی حیثیت خدمت گزار لونڈی ہی کی کیوں نہ ہو۔ میں تو اس سے اپنے دوسرے غلاموں لونڈیوں کی طرح اونٹ اور بکریاں چَرواؤں گا۔"

"واقعی تم بھی کتنے اچھے، لائق سردارِ قریش ہو۔"

خلف کا ایک اور غلام تھا جو حبشی عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام رباح تھا۔ اور عمر تقریباً بیس سال تھی۔ یہ بڑا ذہین، کاریگر اور صائب الرائے تھا۔ اس لئے اپنے آقا کو اس قدر خوش رکھا کہ اس نے اسے آزاد کر کے اپنی اس زمین کا جو سرات میں تھی منتظم بنا دیا۔ دوسرے دن صبح ہوئی تو خلف نے اپنے آزاد کردہ (رباح) کو بُلایا اور مُسکراتے ہوئے کہا:

"تمہارے امیروں میں سے ایک یہ امیرزادی ہے جو کل میرے پاس لائی گئی ہے تمہاری قوم کا جو حشر ہوا وہ تم جانتے ہو۔ میں یہ پکّا ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے اونٹ بکریاں چرانے کا کام لوں۔ کیا میں اسے تمہارے سپرد کر دوں تاکہ تم اسے ایسی ذلّت و خواری کا مزہ چکھاؤ جس کی یہ مستحق ہے۔"

"کون سی چیز ہے جو آپ کو اس ارادے سے روک رہی ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ آپ کے مختلف النسل غلاموں کے ساتھ میرا کیا انداز رہا ہے۔ کیا میں ان پر اپنی پوری مضبوط گرفت رکھ کر آپ کی خدمت کے راستے پر ان کو نہیں لگاتا۔"

"ہے تو سہی۔ اچھا جاؤ، اس لونڈی کو لے جاؤ، اور اسے چرواہوں کا لباس پہنا کر اس کے ہم پیشوں میں چھوڑ دو۔"

"لیکن اس میں کوئی ذلّت وخواری نظر نہیں آتی ۔ میرے خیال میں ایک دوسری تجویز ہے ۔ میں اسے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔ شاید اس سے آپ کا مقصد پورا ہو جائے۔"

"وہ کیا ہے پیش کرو۔"

• "میں نہ تو حبشہ کے امیروں میں ہوں نہ سرداروں میں ۔ میں وہاں کا ایک بہت ہی ادنیٰ انسان ہوں ۔ میرے اندر زنگی کی ایک رگ ہے ۔ اگر مجھے آپ کی اس سرزمین میں کھینچ نہ لایا جاتا (وہ میں رہتا) تو اس امیرزادی کے محل میں خادم کی حیثیت سے رہنا بھی گوارا نہ کرتا ۔

(دل سے خوش ہو کر) "تو تم یہ چاہتے ہو کہ تم اسے اپنی بیوی بنا کر رکھو۔"

"اگر آپ اسے حبشہ کے سرداروں کو اور بھی ذلیل و خوار کرنا چاہتے ہوں تو اسے اپنے ایک زنگی غلام کی بیوی بنا دیجئے۔"

"تو جاؤ میں نے اسے تمہاری بیوی بنا دیا ۔ تم اس وقت سے اس کے شوہر ہو اور چاشت کے وقت اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

اس زنگی (رباح) نے اپنی اس تجویز میں بڑی مہارت اور حیلہ گری سے کام لیا تھا اور شاید آج سے پہلے اس نے اپنے آقا کے ساتھ نہ ایسی حیلہ گری کی تھی اور نہ جھوٹ بولا تھا وہ اس امیرزادی کے درجے کو سمجھتا تھا اور اس پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ اس کا آقا اس کو رُسوائی کی سزا دینا چاہتا ہے ۔ دل سے یہ بات رباح کو ناپسند تھی ۔ اس نے دل ہی دل میں ایک ایسا نقشہ بنا لیا تھا کہ اس امیرزادی کی ذلّت و رسوائی کی جو تدبیریں سوچی جا رہی تھیں ان سے وہ اپنے امکان بھر اسے محفوظ رکھ سکے ۔ اس مقصد کے لئے اس کے سوا اور اسے کوئی تدبیر نہ سوجھی ۔ جب اس نے یہ دیکھ لیا کہ یہ امیرزادی اس کی بیوی بن گئی

تو اس کا نفس خوش، دل مطمئن اور ضمیر راضی ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے اپنی حفاظت میں لے لے گا۔ اور اسے ایک بُت بنا کر رکھے گا۔ اس سے مخلصانہ محبت کرے گا۔ اسے محبت کی سب سے اونچی چوٹی پر رکھے گا۔ اور اس بری حالت میں بھی جس میں وہ دونوں گرفتار ہیں اس کی تعظیم و توقیر کو بھی حتی الامکان پوری طرح برقرار رکھے گا۔ شاید اس کے بعد قسمت ان کے دن پھیر دے۔

رباح اپنی اس امیرزادی کو لے کر واپس آ گئے۔ اور اپنی جھونپڑی میں اسے رکھا۔ اس کے ساتھ توقیر و اکرام۔ مہر و اُلفت کی جتنی شکلیں بھی ممکن تھیں ان کو برتے اور باقی رکھنے میں کوئی کمی نہ کی۔ جو کچھ وہ پسند کرتی وہ صبح و شام لے کر آتا۔ دن بھر اسے ناگواریوں سے بچا بچا کر رکھتا۔ اور جب رات آتی۔ بستر پر جانے کا وقت آتا تو دروازے کے باہر ایک گدا ڈال کر دراز ہو جاتا اور ساری رات سو کر یا جاگ کر اس طرح گذارتا کہ ہمہ تن "بیوی" کی طرف متوجہ رہتا۔ سوتا تو اس کے لئے سوتا جاگتا تو اس کے لئے جاگتا۔ لیکن اس کے قریب نہ جاتا نہ اسے ہاتھ لگاتا۔

یہ امیرزادی پہلے تو اپنے اس شوہر کے سامنے بہت عاجز و مسکین بنی رہی لیکن شوہر کی طرف سے یہ توقیر اور مہربانی دیکھی تو اس کی طرف سے مطمئن اور رفتہ رفتہ اس سے مانوس ہو گئی اور اپنے اس مرتبے کو جو اس کی نظروں میں تھا از سر قائم کرنے لگی۔ اب وہ شوہر سے اس طرح باتیں کرتی جس طرح آقا اپنے غلام سے کرتا ہے۔ اس میں تواضع۔ بردباری اور شیرینی بھی ہوتی۔ ادھر رباح اس کی طرف سے جس قدر لطف و مہر دیکھتا اس قدر اس کی محبت میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اور اسی قدر وہ اس کے مرتبے کے مطابق توقیر و اکرام کرتا۔ اس طرح دونوں نے مہینے گزار دیئے۔ رباح اپنی بیوی کا بے انتہا خیال رکھتا۔ اور ناپسندیدہ باتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر وہ کام کرتا جس پر اس کا بس چلتا۔ مقصد یہ تھا کہ اس و غلامی کا احساس جس قدر کم ہو سکتا ہے کم ہو جائے اور اس آزمائش میں جتنا

صبر ممکن ہو وہ حاصل ہو جائے۔

نوجوان رباح نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس عورت کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گا جس طرح ایک منکسر و مسکین خادم اپنی بلند مرتبہ اور بزرگ مخدومہ کے ساتھ کرتا ہے۔ ایسی مخدومہ جو اپنے خادم کی ہر چیز پر قابض و متصرف ہو۔ رباح نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ ازدواج محض ایک فریب ہے جو اس عربی آقا (خلف) کو دیا جا رہا ہے۔ اس آقا کو جو حبشہ کی اس امیرزادی کی تذلیل و توہین کے درپے تھا۔ اس میں مضائقہ بھی کیا تھا۔ رباح اپنے آقا (خلف) کی ہر ممکن خیر خواہی کرتا تھا۔ اس کی خدمت میں اخلاص کی جتنی سبیل اس کے بس میں تھی سب اختیار کرتا تھا۔ اس کی دولت کی نہایت اعلیٰ دیکھ بھال اور اضافۂ دولت کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتا تھا۔ ان تمام باتوں سے اس نے صرف اس امیرزادی کو مستثنیٰ رکھا تھا یعنی اس معاملے میں وہ اپنے آقا کا خیر خواہ اور فرمانبردار نہ تھا۔ بلکہ یہاں صرف اپنی اور اپنی قوم کا خیر خواہ تھا۔ اسے امیرزادی سے دلی محبت تھی۔ اور اس کی وہ منزلت جو یہاں سے بہت دور اس کے اپنے ملک میں تھی اس کے پیش نظر اس قسم کی توقیر و تعظیم کا خصوصی برتاؤ اس سے کرتا تھا۔

خلف اور اس کے ہم مرتبہ قریشی سرداروں کی نگاہ میں تو وہ رباح کی بیوی تھی۔ بلکہ ان تمام غلاموں کی نگاہ میں بھی جن پر رباح پوری احتیاط اور سختی سے اپنی سیاست چلا رہا تھا۔ مگر جو روابط ان دونوں کے درمیان تھے یا جو تعلق خود رباح اور ان کے دل کے درمیان تھا اس لحاظ سے وہ اس کی مالکہ تھی۔

یہ نوجوان اس بات کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا اور اس کے دل کی یہ بات وہ بھی سمجھتی تھی۔ وہ اس صورتِ حال پر خوش تھی اسے بڑا اطمینان حاصل

تھا اور وہ رباح کے اخلاص پر یقین رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے بیوی کی طرح پیش آنے کی بجائے ایک امیرزادی کا سا سلوک کرتی تھی اور رباح بھی صبح و شام اس کی اطاعت و رضا جوئی میں لگا رہتا۔ جب تک دن روشن رہتا وہ اس کی دیکھ بھال کرتا اور جب تک رات کی تاریکی رہتی وہ اس کی خدمت کمربستہ رہتا۔ شروع شروع میں تو وہ اس خدمت کو اپنا حق سمجھتی رہی لیکن پھر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ نہیں میں تو صرف ایک لونڈی ہوں میرا کسی پر کوئی حق نہیں بلکہ خود مجھ پر میرے آقاؤں کا حق ہے اور آقاؤں کے واسطے سے خود اس غلام کا بھی۔ کیونکہ ان ہی آقاؤں نے مجھ کو رباح کی بیوی بنا کر اس کے سپرد کیا ہے اور مجھ پر رباح کا حق عائد کر دیا ہے۔ وہ امیرزادی اس بات پر غور کرتی تو اوّل اوّل تو یہ ہوتا کہ وہ اس خیال کو ٹال جاتی مگر یہ ہوا کہ غور و فکر کرنے اور ٹالنے دونوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ اس کے مسلسل غور و فکر کے ساتھ اس نوجوان کی وہ مہربانیاں اور قربانیاں بھی سامنے آتی رہیں۔ جن میں اس کے دل کی خوشی اور زندگی کی خوشنودی شامل تھی لیکن کیا غلام کی زندگی میں بھی خوشنودی کا کوئی عنصر موجود ہوتا ہو۔

اور اب وہ بھی اپنے دل میں ایسے جذبات محسوس کرنے لگی جن میں نوجوان رباح پر نظرِ عنایت، پھر اس کی طرف ایک کشش کا پہلو دخیل تھا پھر یہ بھی محسوس کیا کہ میں اس کی محتاج ہوں۔ پھر یہ ہوا کہ جب وہ زیادہ دیر کے لئے غیر حاضر رہتا تو اسے ایک وحشت اور بے چینی سی ہونے لگتی۔

اس طرح کتنے ہی دن اور ہفتے گزرتے گئے۔ نوجوان رباح کی بے لوث محبت اور سچی وفاداری بدستور جاری رہی۔ اور ادھر امیرزادی کے دل میں اندر ہی اندر ایک بے چینی اور کسک سی محسوس ہوتی رہتی۔ وہ نہ فقط یہ

پہلے سے بھی زیادہ مانوس ہو جانے کی ضرورت اپنے دل میں محسوس کرنے لگی اور اس بات کی تڑپ بھی پیدا ہوتی گئی کہ اس نوجوان نے گذشتہ طویل مہینوں میں اس کے ساتھ جتنا اُنس رکھا ہے اب کاش اس سے بھی زیادہ انیسِ وحشت ہو جاتا۔ یہ تمنا مچلنے لگی کہ دونوں کے درمیان تکلّف کا جو حجاب پڑا ہوا ہے وہ کسی طرح اُٹھ جاتا دونوں آپس میں اس طرح سر جوڑ کے باتیں کرتے جس طرح ایک رفیق دوسرے رفیق سے باتیں کرتا ہے۔ لیکن اس تمنا کے بر آنے کا کوئی قریبی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اس کے دل میں تو اس جوان کے لئے تبسم ہی تبسم بھرا ہوا تھا۔ لیکن ہونٹوں کا یہ حال تھا کہ مسکراہٹ آنے لگتی تو حیا بڑھ کر اسے وہیں دبا دیتی۔ گھلاوٹ کو واپس لے جاتی۔ تاہم جب وہ نوجوان اس کے پاس آتا یا اس سے باتیں کرتا تو وہ اسے ایسی مانوس نظروں سے دیکھتی جس میں سکون۔ نرمی اور گھلاوٹ ہوتی۔ اور وہ نگاہ اس نوجوان کے دل کی گہرائیوں کو مسرّت و سرخوشی سے معمور کر دیتی۔ اس سے آگے ابھی کچھ نہ تھا۔

نوجوان کے دل میں قریب یا دور کی آرزو اب تک نہ پیدا ہوئی تھی اس کے دل میں یہ خیال تک نہ گزرا تھا کہ یہ وسیع خلیج جو ان دونوں کے درمیان حائل ہے کبھی دور بھی ہو سکے گی۔ یا کبھی صبح و شام وہ اس کی طرف آرزو بھری نگاہوں سے دیکھ بھی سکے گا۔ اس کی نظروں میں تو وہ ابھی تک گویا ایک امیر زادی تھی جو تختِ شاہی پر بیٹھی ہوئی ہو جس کی طرف نظریں تو اُٹھ سکتی ہیں لیکن دل نہیں اُٹھ سکتا چہ جائیکہ قدم بھی اُٹھ سکیں۔

ان دونوں رفیقوں کے درمیان یہ رابطہ ایک عجیب سا معمہ بن کر رہ گیا تھا یعنی تمام آزاد و غلام کی نگاہوں میں اور عرفِ عام کی اصطلاح میں

تو وہ دونوں میاں بیوی تھے لیکن ادھر یہ نوجوان اسے بیوی سے بلند تر سمجھتا تھا اور وہ اسے شوہر سے بالاتر نہ سمجھتی تھی بلکہ اب اس کو اور کوئی تمنا بھی اس کے سوا نہ تھی مگر اس کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی حتیٰ کہ موجودہ رابطے کے سوا اور کوئی تعلق ان دونوں کے درمیان ناممکن سا ہو گیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ امیرزادی تو دل و جان سے پروانہ تھی لیکن نوجوان اپنے آپ کو اس دیوانگی و پروانگی سے بہت کمتر درجے پر تصوّر کرتا تھا۔ بعض اوقات امیرزادی کو یہ صورتِ حال اتنی ناگوار ہوتی کہ اس کا دل بھنچ کر رہ جاتا اور کسی کسی وقت تو اسے اس نوجوان پر غصہ تک آجاتا اور وہ سمجھتی کہ یہ مغرور و متکبر ہے۔ حالانکہ وہ سراسر متواضع و منکسر تھا۔ ادھر نوجوان کی خواہش یہ تھی وہ غلام اور رفیق بن کر رہے اور امیرزادی کی خواہش یہ تھی کہ حسن سلوک کو پہچانے، نعمت کی شکر گزار ہو اور نیکی کا اعتراف کرے۔ اگر دونوں طرف یہ شریفانہ جذبات نہ ہوتے تو دونوں کے تعلقات میں شگاف پڑ جاتا۔ کیونکہ جب دو محبت کرنے والوں کے تعلقاتِ محبت اپنی انتہا کو پہنچ جائیں۔ اور پھر محبت اور مقصدِ محبت کے درمیان بلند دیواریں حائل ہو جائیں تو تعلقات محبت میں بڑی تیزی سے فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امیرزادی کا دل بھنچنے لگا اسے کبیدگی سی محسوس ہونے لگی یہاں تک کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی طبیعت میں بدمزاجی جگہ بنا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر نوجوان نے حقِ رفاقت ادا کرنے میں اور اضافہ کر دیا۔ لیکن امیرزادی کی کڑھن اور زیادہ بڑھ گئی۔ آخر ایک دن اس نے کہا:

"تم میرے ساتھ حسنِ سلوک اور مہربانی کرنے میں بڑے مبالغے سے کام لیتے ہو۔ تم چاہتے ہو مجھ پر احسان کرنا اور ہونے لگتی ہے میرے ساتھ برائی۔ تم جانتے ہو گے کہ میں اس عنایت و مہربانی کی جگہ تمہاری طرف سے اور شے

کی محتاج ہوں۔"

(بڑے انکسار و عاجزی سے) کس شے کی۔

(دل کے ٹکڑے اڑا دینے والے نشتریں مذاق کے انداز میں) شاید تمہیں خبر ہو کہ تم آزاد ہو اور میں ــــ"

(بات کاٹ کر) "کچھ ہی دن تو ہوئے ہیں کہ آزادی ملی ہے ورنہ دو سال سے تو غلام ہی تھا۔"

"دو سال سے؟ اور اب تمہاری آزادی واپس آ گئی۔ غلامی ختم ہو گئی پھر تو تمہارا درجہ مجھ سے بلند تر اور تمہارا حال مجھ سے بہتر ہے۔ آخر تمہاری یہ عاجزی اور مسکینی اور یہ بے دریغ مہربانیاں مجھ پر گزشتہ دنوں سے اتنی کیوں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تمہیں بلند اور مغرور ہونا چاہیئے۔ مگر یہ تو ضرور کہہ سکتی ہوں کہ تم میری اور اپنی آج کی حالت کو بھی پیش نظر رکھو اور اس حالت کو بھی جسے ہم دونوں کل اختیار کرنے والے ہیں۔ تم ہو کہ ہر دم میرے امیرزادی ہونے کو پیش نظر رکھتے اور میرے حقوق امیرزادگی کی حفاظت میں لگے رہتے ہو۔ حالانکہ تمہیں خیال یہ کرنا چاہیئے کہ میری امیرزادگی زمانۂ گزشتہ کے ساتھ کب کی رخصت ہو چکی۔ میری گردن میں غلامی کا طوق اس وقت پڑا ہے جب کہ تم آزادی حاصل کر چکے تھے اور اس آزادی کے بعد ہی تم نے مجھے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔"

"بیوی تو میں نے صرف اس لئے بنایا تھا کہ آپ کے ساتھ جو بدسلوکی ہونے والی تھی اس کو کسی طرح روکوں۔"

"تو وہ تو تم کر چکے اور میں اس کی بے حد شکر گزار ہوں لیکن تم نے مجھے اپنی بیوی بھی تو بنایا تھا تو پھر ہم دونوں کے درمیان وہ ارتباط بھی ہونا چاہیئے

جو میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔"

یہ سن کر رباح کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکنے لگے۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ یہ غم کے آنسو ہیں یا شادمانی کے۔ اسی آن امیرزادی کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ چہرے پر سُرخی جھلکنے لگی۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی۔ کہ یہ سرخی شرم وحیا کی ہے یا اس مسرّت کی کہ اس نے آخر کار اُن خود داریوں کو ڈھا دیا جو ان دونوں کے درمیان حائل تھیں۔

ایک دن خلف سرات میں اپنی جائداد دیکھنے آیا اور ویسا ہی پایا جیسا چاہتا تھا اور اپنے منتظم رباح سے جیسا کچھ سُننا پسند کرتا تھا وہی کچھ سنا بھی۔ غرض یہ ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا، سنا اور معلوم کیا اس سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اپنی جائداد کا جیسا انتظام وہ دیکھنا چاہتا تھا ویسا ہی چل رہا تھا یعنی کثیر دولت۔ پیداوار کی بڑی مقدار اور رباح کی ایسی امانت داری جو شبہے سے بالاتر تھی۔ خلف کی خوشنودی اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے اپنے منتظم کو اس کی کوششوں اور محنتوں کا معاوضہ ادا کرنے کی خواہش ظاہر کر کے اسے کچھ اونٹ اور بکریاں انعام میں دیں اس کے علاوہ پیداوار کا بھی ایک حصّہ اس کو دیا۔ وہ اس کے احسان کا شکر گذار ہوا اور اس کا دل اس سے بہت مطمئن اور خوش ہوا۔ اس کے بعد اس منتظم (رباح) نے راضی خوشی واپس ہونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ خلف نے اسے روکتے ہوئے چھیڑ کے لہجے میں پوچھا:

"ارے بھئی رباح! تم دونو (میاں بیوی) میں بانجھ کون ہے۔ مدت ہوئی میں نے اس حبشی عورت کا تمہیں مالک بنا دیا تھا اور ابھی تک تمہیں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔"

رباح ذرا اکٹ گیا۔ اس نے جواب دینے کا ارادہ کیا مگر شرم نے اس کے

لبوں پر مہر لگا دی۔ اس نے نگاہیں نیچی کر کے زمین کی طرف گردن جھکالی۔ غلف نے ہنستے ہوئے اپنی گفتگو پھر دُھرائی اور اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے پوچھا:

"بتاؤ تم دونوں میں بانجھ کون ہے؟"

(ذرا جرأت مگر احتیاط سے) "ہم بانجھ ہوں یا صاحب اولاد۔ آپ کو اس سے کیا غرض؟"

"ذرا ٹھہرو تم تو بے شک آزاد ہو چکے ہو لیکن تمہاری عورت ابھی تک لونڈی ہے۔"

(ذرا تیز لہجے میں) "تو یوں کہئے کہ آپ نے مجھے اس سے اس لئے بیاہا ہے کہ جس طرح اونٹوں اور بکریوں کو پیداوار کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح مجھ کو اور اس کو بھی استعمال کریں۔"

"ربلح تمہیں غصّہ بہت جلدی آجاتا ہے۔ میری نیت تمہارے ساتھ کسی برائی کی نہ تھی۔ میں تو تمہارے ساتھ مہر و لطف کرنا چاہتا ہوں اور تمہارے بعض معاملات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

(اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے) "اچھا تو میرا جو معاملہ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں معلوم کر لیجئے۔ افسوس مجھے یہ بالکل یاد نہ رہا کہ وہ لونڈی ہے اور اس کا بچّہ بھی اسی کی طرح غلام ہوگا۔"

"اچھا تو اس کے ایک لڑکا بھی ہوگیا ہے؟"

"جی ہاں۔ لیکن اگر میرا دل اس پر آمادہ ہوتا اور میری بیوی بھی میرا ساتھ دیتی تو میں بھی اسی طرح اس کو زندہ درگور کر دیتا جس طرح آپ لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ علم ہو جائے کہ اس سے نسل کشی کا اس طرح کام لیا جا رہا ہے جس طرح اونٹ سے لیا جاتا ہے تو اس کے لئے یہ

کوئی خوشی و مسرت کی بات نہیں۔"

(ذرا افسوس کے لہجے میں)"خدا کی مار تجھ پر۔ خواہ مخواہ اپنے دل پر بھی بار لے رہا ہے اور میرے دل پر بھی بوجھ ڈال رہا ہے۔ ارے بھئی بخدا میں نے تمہیں پیداوار یا نسل کشی کے لئے استعمال کرنے کا کوئی خیال بھی نہیں کیا۔ رباح تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے پہلے تجویز پیش کی تھی کہ اس عورت کو میرے چرواہوں میں داخل کر کے چرواہن بنا ڈالو۔ مگر تم نے یہ خواہش کی کہ اسے تمہاری بیوی بنا دیا جائے تمہارا گمان یہ تھا کہ اس طرح اس تذلیل کی پوری تکمیل ہو جائے گی جو میں اس کے لئے چاہتا تھا خیر اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔ تمہارے ساتھ کیا معاملہ در پیش ہے؟

اس وقت رباح نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اسے وہ حیلہ گری یاد آ گئی جو اس نے اس امیرزادی کو بدسلوکی سے بچانے کے لئے کی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس نے اس حیلے کے سوا کبھی اپنے آقا کو نہ فریب دیا اور نہ اس سے جھوٹ بولا۔ اس کی انتہائی خواہش یہی تھی کہ اپنے اس فریب یا دروغ کو چھپائے رہے مبادا اسے یا اس کی بیوی کو کوئی گزند پہنچے۔ لہٰذا وہ ایسی بناوٹی ہنسی ہنسا جو سے بہتر ہوتا ہے رونا۔ اس کے بعد بولا:

"آپ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں؟ وہ میرے دل میں اتر گئی اور میں اس سے محبت کرنے لگا۔"

"تم اس سے محبت کرنے لگے حالانکہ تم اسے رسوا کرنا چاہتے تھے؟"

"یہ ایک امیرزادی ہے جو لونڈی بن گئی اور ایک ایسے غلام سے بیاہی گئی جو اس کی خدمت کرنی بالکل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اس بوجھ کو خوشی خوشی اٹھا لیا۔ شوہر سے خوش رہی اور اس کے ساتھ نیک بختی سے بسر

رتی رہی۔ اب بتائیے میں کیا کروں کس طرح اس کی اہانت و تذلیل کروں؟"

(غمگین لہجے میں) بات تو یہی ہے۔ بالکل یہی کہ تم دونوں کے درمیان درجے کا جو تفاوت اور منزلت کا جو اختلاف تھا اسے غلامی نے ختم کر دیا ہے۔"

(ہنس کر) لیکن کیا یہ عجیب وغریب معمہ نہیں کہ غلامی تو لوگوں میں برابری پیدا کر کے درجے کے تفاوت اور منزلت کے اختلاف کو ختم کر دے مگر آزادی لوگوں میں تفریق پیدا کر کے کسی کو غنی کر دے اور کسی کو فقیر کسی کو قادر بنا دے کسی کو عاجز کسی کو قوی کسی کو ضعیف۔ کسی کو آقا اور کسی کو ماتحت؟ رات کی تاریکی کب ختم ہو گی اور چمکتی ہوئی سہانی صبح کی پو کب پھوٹے گی؟"

"تمہارا بُرا ہو۔ کیا بک رہے ہو؟ کیسی رات اور کون سی صبح؟"

رات تو یہ زمانہ ہے جس میں ہم سب زندگی گذار رہے ہیں اور جہاں غلامی تو غلاموں میں مساوات پیدا کر دیتی ہے مگر آزادی آزادوں میں تفریق پیدا کر دیتی ہے۔ اور صبح وہ آنے والا زمانہ ہے جس میں آزاد اور غلام سب برابر ہوں گے اور امتیاز صرف اعمال اور امتحان کی بدولت قائم ہو گا نہ کہ منزلتوں اور دولتوں کی مقدار کی بنیاد پر۔"

(زور سے قہقہہ لگا کر) "رباح! آج تو تم کاہنوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ اچھا چھوڑو اپنی تاریک رات اور روشن دن کا ذکر۔ اس لڑکے کا حال سناؤ جسے تم زندہ در گور کرنے کا ابھی ارادہ کر رہے تھے۔ اس کا نام کیا ہے؟ اس کی شکل کیسی ہے؟"

"آپ میری رات اور میری صبح پر ہنستے ہیں۔ مذاق اُڑاتے ہیں لیکن میری رات بہرحال گذرے گی اور ممکن ہے کہ اس کا گذرنا ہم آپ بھی دیکھ لیں میری صبح بہرحال آ کے رہے گی اور شاید ہم آپ بھی اس کی روشنی دیکھ لیں۔ اگر ہم دونو

اسے نہ دیکھ سکیں تو آپ کا فرزند امیہ اور میرا لڑکا بلال اسے ضرور دیکھ لے گا۔"
(سر کو جنبش دے کر اور مونڈھوں کو اوپر اُٹھا کر) بس بس اتنی گفتگو کا
ہے۔ اب یہ باتیں کسی اور سے نہ کرنا۔ میرا معاملہ تو یہ ہے کہ تمہارے فرزند کا جو
تمہارے خاندان میں ہے اس کی وجہ سے میں تمہارے انعام میں مزید اضا
کروں گا۔ البتہ میں اگر پہلے ایک بہت بڑی قسم نہ کھا چکا ہوتا تو میں تمہاری ب
کو ضرور آزاد کر دیتا اور تمہاری طرح تمہارے فرزند کو بھی آزادی دے دیتا
تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیوی ہم پر حملہ آور ہو کر آئی تھی۔ ہماری اہانت او
بے حرمتی کا ارادہ لے کر آئی تھی۔ اس لئے اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے د
تم دونوں اپنے فرزند کے ساتھ زندگی گزارو۔ اور جب تک میں زندہ ہوں تمہ
کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

(سر کو جنبش دیتے ہوئے مذاق کے انداز سے) "اچھا یہ حملہ آور ہو کر
تھی؟ حملہ آور ہو کر۔ مگر اسے کیا معلوم کہ حملہ کیا ہوتا ہے؟ وہ تو ایک بھولی
نوجوان لڑکی تھی جو اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ غلطی بڑے لوگ کر
ہیں اور ان کی غلطیوں کا خمیازہ چھوٹوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔"

"رباح! میں نے تم جیسا سمجھدار آدمی واقعی کبھی نہیں دیکھا۔ خیر اب
جاؤ اور اپنی زندگی مزے سے گذارو۔ مگر اپنی ان حکیمانہ باتوں کی عام لوگو
میں اشاعت نہ کرنا ورنہ کسی ناگوار صورتِ حال سے تمہیں سامنا کرنا پڑ

اس کے بعد جب تک خدا کو منظور ہوا رباح اور حمامہ دونوں زندگی گذا
رہے اور زندگی نے ان کی قسمت میں جو کچھ لکھ دیا تھا اس پر صابر و شاکر رہے
اور با اطمینان اپنے دونوں فرزندوں کی طرف متوجہ رہے جن میں ایک تو بلا
تھا اور دوسرا اس کا بھائی۔ جس کا نام تک تاریخ نے فراموش کر دیا۔ بس اس

باتوں کا ذکر تاریخ میں موجود ہے۔ یہ والدین ان دونوں فرزندوں کی
رش اس طرح کرتے رہے جس طرح ان جیسے دوسرے لوگ کرنے کے عادی ہیں
ان کی پرورش ایسی تھی جیسی آزادی اور غلامی کے درمیانی منزل میں رہنے
ں کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ دونوں میاں بیوی اس دنیا سے رخصت
لئے۔ اور اس دنیا میں اپنے دو غلام فرزندوں کو خلف کی جائداد واملاک کی
بھال بلکہ سارے قبیلہ جمح کی خدمت گزاری کے لئے چھوڑ گئے۔

خلف بھی جب تک خدا کو منظور ہوا زندگی گذارتا رہا۔ وہ جب دنیا سے
لت ہوا تو اپنی جگہ اپنے بیٹے امیہ کو چھوڑ گیا۔ اُمیہ ایک مضبوط جفاکش نوجوان تھا
و کچھ مال واسباب۔ زمین۔ جائداد مویشی اور غلام وغیرہ اس کا باپ چھوڑ
تھا اس کا وہ بھی اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح وارث ہوا۔ رباح اور حمامہ
واس تاریک رات کا گذرنا اور روشن صبح کا طلوع ہونا نہ دیکھا۔ البتہ
ی نے اس صبح روشن کا طلوع دیکھ لیا۔ اور اس کے نور سے اس کا دل
بھی ہوا۔ اس صبح روشن کو طلوع ہوتے تو امیہ نے بھی دیکھا مگر اس کا
ب تاریکیوں سے بھرا رہا۔

بلال کا معاملہ یہاں تک پہنچا کہ نبی اکرمؐ کے سب سے زیادہ
وب اور سب سے زیادہ قابلِ ترجیح ہو گئے اور اُمیہ کی یہ نوبت آئی کہ
ور کی نگاہوں میں وہ سب سے زیادہ قابلِ نفرت ٹھہرا۔ اور آخر کار
میں مارا گیا اور پیغمبر کی دشمنی کا وارث اپنے بھائی اُبی کو بنا گیا۔ وہی
جس نے اُحد کے موقعے پر حضورؐ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن
ورؐ نے اپنے نیزے کی جنبش سے اس کی موت کا دروازہ کھول
یا۔

اُمیہ ایک دن یہ دیکھنے آیا کہ ابوجہل خاندان یاسر کو کس طرح کی سزائیں دیتا ہے۔ وہ کھڑا ہو کر یہ تماشا دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلا کر ابوجہل سے بولا:

"کل جمح کے محلے میں آ کر دیکھو کہ ہم کس طرح ان زیردست صحابیوں کو اور خصوصاً اُن کے سرگروہ بلال کو سزائیں دیتے ہیں۔"

(۱۰)

"ہائے تم لوگ اس لڑکے کے ساتھ بڑی سختی اور ظلم کا برتاؤ کر رہے ہو۔ میں نے آج تک ایسے سنگ دل، جفا پیشہ اور سخت مزاج انسان کبھی نہیں دیکھے"

امِّ انمار نے یہ الفاظ کہے اور دیوانہ وار بنی عامر کے اس دہقانی ہجوم میں کود پڑی۔ اس نے کسی کے سینے پر گھونسا مارا اور کسی کا کپڑا پکڑ کے کھینچا۔ غرض یہ تھی کہ کوئی اس لڑکے کو ظالموں سے بچائے جو اس کی گدّی اور سر پر مسلسل مار رہے تھے اور بُرا بھلا کہتے جاتے تھے۔ بنی عامر کا یہ گروہ نجد سے آیا تھا۔ ان کے ساتھ سواریاں تھیں جن پر عراقی مالِ تجارت لدا ہوا تھا۔ یہ جب اپنا مال اور مال لادنے والے جانور فروخت کر چکے تو اپنے اس غلام کو بھی بیچنا چاہا۔ اسے یہاں وہاں کئی جگہ دکھایا لیکن اس کا کوئی خریدار نہ ملا۔ بلکہ اس کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ دی۔ اس کی وجہ سے وہ اس سے دل برداشتہ ہو گئے، اور سنگ دلی کا برتاؤ شروع کر دیا۔ انھوں نے ارادہ یہ کیا کہ اسے اپنے ساتھ واپس لے جائیں کہ شاید راستے ہی میں کوئی عربی قبیلہ ایسا مل جائے جس میں اس کا خریدار پیدا ہو جائے۔ لیکن اس غلام نے واپس جانے سے انکار کیا کیونکہ اب تک یہ لوگ اسے جو اذیتیں پہنچا چکے تھے اور بد سلوکیاں کرتے رہے تھے اس کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ واپس جانے پر آمادہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جب اس نے بھاگنا چاہا تو اس پر یہ سختیاں شروع کر دی گئیں۔ یہ زدو کوب کر ہی رہے تھے کہ امِ انمار خزاعیہ کی نظر

پڑگئی۔ اس کا دل پسیج گیا اور اس مظلوم کو دیکھ کر اسے رحم آگیا۔ چنانچہ وہ اس کو بچانے کے لئے آگے بڑھ گئی تو اس عامری گروہ میں سے کسی نے ام انمار سے کہا:

"تیرا اس سے کیا واسطہ؟ میں نے ایسی بے ہودہ عورت تو آج تک نہیں دیکھی۔ اگر تو اس حرم سے باہر کہیں ہوتی تو ہماری طرف سے ایسا جواب ملتا جو تجھے کبھی گوارا نہ ہوتا۔"

(غصّے کو دبا کر اور سکڑے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر کے) "مگر میں تو اس حرم میں ہوں تمہارے ہاتھ میری طرف نہیں بڑھ سکتے۔ تم اپنے ان لمبے چوڑے جسموں کو دیکھو۔ اپنی ان داڑھیوں کو دیکھو جن پر بڑھاپے کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں اور ان کلوں کو دیکھو جو اپنے شانوں پر پھیلائے ہوئے ہو اور دوسری طرف اس لاغر و کمزور بچے کو دیکھو جس پر تم اپنے ہاتھ آزما رہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟

"اگر تجھے اس کے کھانے اور اس کے بوجھ کو سنبھالنے کی وہی مصیبت اٹھانی پڑتی جو ہمیں اٹھانی پڑ رہی ہے تو تجھے کبھی اس پر کوئی رحم نہ آتا اور نہ مہربانی کی یہ نظر ہوتی۔ بخدا یہ ایک ایسا نالائق غلام ہے کہ اس کا بوجھ اُٹھانے کی کلفت کو کچھ ہم ہی جانتے ہیں اور پھر یہ ہمیں کوئی فائدہ بھی تو نہیں پہنچاتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہمارے حکم کی مخالفت کرتا ہے ہمارے ساتھ جانے سے انکار کرتا ہے۔ گویا اسے یہ شہر پسند آگیا ہے حالانکہ یہاں کے کسی باشندے کو بھی یہ پسند نہیں آیا۔"

"لیکن مجھے تو یہ پسند ہے۔"

"تو چلو ابھی اس کی قیمت ادا کرو اور لے جاؤ اپنے ساتھ۔ اس منحوس بے برکت شخص کو۔"

ان عامریوں اور امِ انمار کے درمیان دیر تک مول تول ہوتا رہا۔ اور بار بار ردّ و قبول اور کھینچا تانی ہوتی رہی۔ آخر چند درہموں کی معمولی قیمت پر ام انمار کے نام اس غلام کی بولی دے دی گئی۔ ادھر وہ عامری گروہ اپنے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتار کر روانہ ہوا، ادھر امِ انمار اس لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر گویا گھسیٹتی ہوئی اپنے گھر لائی جو بنی زہرہ کے محلے میں واقع تھا۔ لڑکا حد درجے کا کمزور۔ لاغر اور مریض سا تھا اور بھوک سے ادھ موا ہو رہا تھا۔ ام انمار بنی زہرہ کے جن مردوں اور عورتوں کے پاس سے گذرتیں ان کے طعنے سنتیں کہ:

"ہے تیرا بُرا ہو امِ انمار یہ کیا چیز سائے کی طرح گھسیٹتی ہوئی لئے جا رہی ہے"

وہ جواب دیتی کہ "تمہیں اس سے کیا غرض؟ یہ ایک غلام ہے جو میں نے ابھی خریدا ہے۔ میں اسے خوف سے بچاؤں گی، اسے کھانا کھلاؤں گی، اسے اپنا خادم اور اپنے بیٹے کا ساتھی بناؤں گی۔"

امِ انمار اس لڑکے کو گھر لے آئیں۔ اسے کھلا پلا کر کپڑے پہنائے۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اس کے اُترے ہوئے غمگین چہرے پر خوشی اور اطمینان کی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنے فرزند عبدالعزّیٰ کو اس کا بھائی بنا دیا اور دونوں کو کھیلتا ہوا چھوڑ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ مکّے کے بہت سے گھروں میں گھومتی پھرتی۔ ہر جگہ اس کے وہ اوزار اس کے ساتھ ہوتے جس سے وہ اپنے لئے اور اپنے فرزند کے لئے روزی کماتی تھی۔ اس کا پیشہ تھا ختنے کرنا۔ اس روز سے وہ بار بار دل ہی دل میں کہتی کہ ہے ہے امِ انمار! تو پہلے تو صرف اپنی اور اپنے بچّے کی کفالت کی ذمے دار تھی اور اب دو بچوں کی کفالت کا بار اپنے سر لے لیا۔"

مگر پھر اپنے دل کو یوں سمجھاتی کہ اُمّ انمار! اس کی پروا نہ کر جب یہ (دوسرا) بچہّ مضبوط ہو جائے گا اور کچھ بڑا ہو جائے گا تو تجھے بہت فائدہ پہنچائے گا تیرے لئے اپنے امکان بھر پیسے کمائے گا اور آڑے وقت میں کام آئے گا۔"

یہ اُمِّ انمار ایک خزاعی عورت تھی جو مکّے میں مقیم ہو گئی تھی اور وہیں بنی زہرہ کے کسی حلیف سے شادی کر لی تھی اور اپنے اوزار لے کر قریش کے گھروں میں جایا کرتی اور اس طرح اپنی زندگی گزارتی۔ اب اس کی جوانی ڈھل چکی تھی بڑھاپا آہستہ آہستہ آرہا تھا۔ وہ یوں تو بہت خاموش تھی لیکن جب چھیڑ دی جاتی تو پھر نہ تو وہی خاموشی کی طرف راہ پاتی، نہ خاموشی کو اس کے قریب آنے کا کوئی راستہ ملتا۔

اس دن شام کو جب وہ گھوم پھر کر واپس آئی تو دیکھا کہ اس کا فرزند اور یہ غلام دونو مختلف کھیلوں میں مصروف ہیں اور کھیلتے کھیلتے تھک سے گئے ہیں اُمّ انمار نے دونو کو کھلایا پلایا اور اس غلام سے بڑے پیار سے باتیں کرتے ہوئے پوچھا:

"بیٹے! تمہارا کیا نام ہے؟"

"خبّاب"

"باپ کا نام؟"

"ارتّ"

اس نے ارتّ تو کہا مگر حرف "ر" کو پوری طرح نہ نکال سکا۔ جیسا کہ عام بچےّ بڑے ہونے اور زبان صاف ہونے سے پہلے "ر" کو لام اور ی کی درمیانی آواز سے بولتے ہیں۔ اس کے بعد اُمّ انمار نے پوچھا:

"خبّاب بن ارتّ! بیٹے تم عرب کے کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟

"معلوم نہیں۔"

"کیا تم عجمی ہو؟"

"عجمی؟ عجمی کیا؟ مجھے معلوم نہیں۔"

"تمہاری ماں کا کیا نام ہے؟"

اس سوال پر وہ بچّہ اس طرح سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا کہ اس بڑھیا کا دل پسیج گیا۔ اس نے پھر یہ سوال نہ کیا اسے دلاسا دیتی رہی، اس کے آنسو پونچھتی رہی یہاں تک کہ اسے کچھ اطمینان و سکون ہوا تو پھر اسے بستر پر لٹا کر پیار کی باتیں کرتی رہی تا آنکہ اسے نیند آگئی اور امِ انمار نے اس کے حالات معلوم کرنے کے خیال کو کل پر ٹال دیا۔

اُمِّ انمار دوسرے تیسرے دن برابر اس فکر میں لگی رہی کہ اس کا پورا قصّہ معلوم کرے۔ بڑی کوشش اور عرصے کے بعد جس میں لڑکے کا رونا دھونا بھی شامل تھا اور امِ انمار کا پیار دلاسا بھی۔ اسے معلوم ہوا کہ بنی عامر کا یہ گروہ اچانک بے خبری میں اس بچّے کے گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس وقت محلے کے لوگ کہیں باہر تھے۔ باپ نے اپنی طاقت بھر پورا مقابلہ کیا۔ مگر اس گروہ نے اسے اس کی بیوی اور بیٹی کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا۔ اس کی نوجوان بیوی کا نام اسماً تھا جس کا فرزند یہ بچّہ (خبّاب) ہے۔ پھر ان ڈاکوؤں نے اس کی ساری پونجی پر قبضہ کر لیا اور بقیّہ خاندان کو اسیر کر لیا۔ ماں کو تو ایک عربی قبیلے کے ہاتھ فروخت کر دیا اور خبّاب کی بہن کو دوسرے عربی قبیلے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ پھر خبّاب کو اور ارتّ کے مال و اسباب کو لے کر چل دیئے۔ مال و اسباب کو تو اونے پونے بیچ ڈالا۔ مگر بچّہ نہ بک سکا جسے آخر امِ انمار نے خریدا۔ یہ حالات معلوم کرنے کے بعد امِ انمار نے اس بچّے کے ساتھ کبھی وہ سلوک نہ کیا جو آقا اپنے غلام

کے ساتھ کرتا ہے بلکہ اس طرح رکھا جیسے ماں اپنے بچے کو رکھتی ہے۔ مہینے اور سال گزرتے رہے اور یہ لڑکا بھی یہ بھول گیا کہ وہ اِمِ انمار کا غلام ہے۔ وہ بھی یہی سمجھنے لگا کہ وہ بھی اِمِ انمار ہی کا لڑکا ہے۔ اس کے بیٹے عبدالعزیٰ کا بھائی ہے۔ بڑے ہونے کے بعد بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ تمیمی ہے اور بنی زہرہ کا حلیف ہے۔ جب وہ کچھ کمانے کے قابل ہوا تو اِمِ انمار نے اسے ایک آہنگر کے سپرد کر دیا۔ جہاں وہ آہنگری اور اسلحہ سازی کا کام سیکھتا رہا۔ ابھی اپنی عمر کے بیسویں سال میں تھا کہ وہ اپنے لئے اور اپنی ماں (اِمِ انمار) کے لئے کچھ روزی کمانے کے قابل ہو گیا۔ پھر اس نے ایک دکان کھول لی جس میں وہ آہنگری اور اسلحہ سازی کیا کرتا تھا۔

یہ غلام بھی اپنے ان ہی ہم جنسوں کی طرح پرورش پاتا رہا تھا جو اسیر ہو کر آئے یا قسمت نے ان کے باپ دادوں کو یہاں ڈال دیا تھا۔ یہ ایسی حالت میں پروان چڑھا کہ اسے غلامی کا کوئی احساس تو نہ تھا لیکن آزادی کی مٹھاس سے بھی محروم تھا۔ نہ تو وہ پورا غلام تھا نہ پورا آزاد۔ بس درمیانی حالت میں تھا۔ وہ اپنے اردگرد ایک طرف تو بوڑھے سرداروں اور آسودہ حال جوانوں کو دیکھتا تھا اور دوسری طرف پست حال، کمزور اور زیردست بوڑھوں کو دیکھتا تھا اور ان جوانوں کو بھی جن کے دل میں امنگیں تو پیدا ہوتی تھیں مگر ان کے ہاتھ، ان کے ارادے اور ان کے ذرائع ان امنگوں کو حاصل کرنے سے قاصر تھے۔ زیردست بوڑھوں کے دل میں یہ اعتقاد گھر کئے ہوئے تھا کہ یہ سب قضا و قدر کے کھیل ہیں جس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ وہ اپنے آقاؤں کا بظاہر تو اکرام کرتے تھے مگر دل میں بغض و عناد رکھتے تھے۔ اور زیردست نوجوانوں کے دل میں ایسا غصہ بھرا تھا کہ

گ کبھی بجھی نہ تھی اور ایسا عناد موجزن تھا جس کی تپش کم نہ ہوئی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ "ہم تو ان آسودہ حال جوانوں سے کسی بات میں کم نہیں۔ نہ ذہانت میں نہ عقل میں نہ سوجھ بوجھ میں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان سے دولت میں زور میں اور اختیار میں سب میں کمتر ہیں۔ اور زندگی کے ایسے موڑ پر ہیں جو کسی طرح ساعد نہیں۔ سازگار نہیں۔ بلکہ حالات ایسے ہیں جو بہتری اور ترقی کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہیں۔ ہمارے متعلق گویا یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ ہمیشہ تابع فرمان رہیں۔ زندہ رہیں تو تابعدار بن کر۔ ہماری کشادگی، ہماری راحت، ہماری عزت اور ہماری ترقی کی کوئی سبیل اور اُمید نہیں۔ ہم گویا ایسے گھوڑے ہیں جو بندھے ہوئے بس اپنی لگام چباتے رہیں۔ اور سب سے بڑی مسرت اگر کوئی ہے تو یہی کہ کسی طرح ہمارے بدن سے روح نکل جائے اور قصہ پاک ہو۔"

یہ زیردست نوجوان جب الگ ایک دوسرے سے ملتے تو اپنی موجودہ حالت پر طرح طرح سے گفتگو کرتے اور یہ گفتگو ہمیشہ ایک گھٹی ہوئی حسرت اور دبے ہوئے غصّے پر ختم ہوتی۔ ان کی نگاہیں متمدن شہریوں اور بدوی قبیلوں کے ماحول پر پڑتیں تو ان کی آرزوئیں خون ہو کر رہ جاتیں اور ایک بے بسی مایوسی ان پر چھا جاتی۔ وہ مکّے کی زندگی کو دیکھتے۔ جہاں ان جیسوں کے لئے ہر ممکن آسائش مہیا تھی کیونکہ وہاں امن تھا۔ سلامتی تھی۔ جان و مال کی لُوٹ نہ تھی۔ وہاں کے ایک خاص موسم میں ہر طرف سے قبائل عرب اپنا مالِ تجارت لے کر کھنچ آتے تھے۔ غرض ہر طرح مکّے میں سکون اور رزق کی فراوانی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نعمت کے دروازے صرف ان لوگوں کے لئے کھلے تھے جن کی امارت یا وطنی و نسبی شرافت یہ دروازے کھولنے کا موقع دیتی تھی۔ وہ وہاں سے نکل نکل کر دور دراز کے ملکوں میں جاتے اور جب واپس آتے

توان کی تھیلیاں بھری ہوتیں۔ وہ اطرافِ زمین کا چکر لگاتے، سیاحت کرتے اور اپنے آپ کو فائدہ پہنچاتے۔

خبابؓ ایک دن اپنے ایک دوست سے ملے تو اس نے خباب سے کوئی ایسی گفتگو ہی نہ کی جو اس سے پہلے ان دونوں میں ہوا کرتی تھی۔ خبابؓ نے دیکھا، کہ اس کے دوست میں وہ مایوسی نہیں۔ وہ غم دور ہو چکا ہے اور جیسے کسی دُور کی جھلکنے والی اُمید سے وابستگی اسے پیدا ہو گئی ہے۔ خبابؓ نے اپنے دوست سے پوچھا:

"کیا بات ہے؟ میں تمہارے اندر ایک ایسا انداز محسوس کر رہا ہوں جو اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ میں نے تو اپنے کسی دوست کو اتنا بیگانہ محسوس نہیں کیا جیسا آج تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

مگر اس دوست نے اس کی بات کا کوئی ایسا جواب بھی نہ دیا جو وہ پہلے دیا کرتا تھا بلکہ صرف یہ آیت پڑھ دی کہ

اقراء باسم ربك الذی خلق ۔ خلق الانسان من علق ۔ اقرأ وربك الاكرم الذی علم بالقلم ۔ علم الانسان مالم یعلم ۔ کلا ان الانسان لیطغی ان راہ استغنی ۔ ان الی ربك الرجعی ۔

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو مضغۂ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جس سے وہ آگاہ نہ تھا۔ مگر نہیں انسان سرکشی پر اتراتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگتا ہے۔ (اور) آخر کار لوٹ کر تجھے رب ہی کی طرف جانا ہے۔

خبابؓ نے یہ کلام سنا تو اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کے

دانت بجنے لگے اور گھٹنے ٹکرانے لگے مگر اس کے دوست نے اسے تھوڑی دیر تک اسی طرح اس کے حال پر چھوڑ دیا جب اس کو سکون ہؤا اور اطمینان کے ساتھ وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا تو اس نے اپنے دوست سے کہا "ذرا ان جملوں کو پھر تو دہراؤ" میں نے اپنے دل میں ایک تپش سی محسوس کی ہے۔ میری عقل اس کی تہ تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس کے دوست نے ان آیات کو ایک ایک کر کے دُہرایا اور خبّاب نے آخری آیات کو اپنے دوست کے سامنے دہراتے ہوئے پوچھا کہ:

"یہ کیسا کلام ہے؟ کلا ان الانسان لیطغی۔ ان راٰہ استغنی۔ ان الی ربك الرجعی۔ یہ کلام تمہاری زبان سے تو نکلا نہیں۔ تم نے اسے کہاں سنا؟ کوئی صورت ایسی ہے کہ میں بھی سنوں۔ یہی کلام ایسا ہی کلام؟"

"ہاں اگر تم چاہو تو میرے ساتھ اس امین کے پاس ابھی چلے چلو۔ وہی ہمیں کلام پڑھ کر سناتا ہے جو اس پر آسمان سے نازل ہوتا ہے"

ایک دن صبح ابو جہل مسجد حرام کے اندر اپنی قوم کی محفل میں آیا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اس نے اپنی ران پر ہاتھ مار کہا کہ:

"بھئی چاہو تو تم بھی چل کر ایک عجیب تماشا دیکھنا۔ ختنے کرنے والی (امِّ انمار) کا بیٹا (خبّاب) بھی صابی ہوگیا ہے اور ہم دوپہر سے پہلے پہلے اسے آگ میں جھونک دیں گے"

(۱۱)

مسعود بن غافل بنی ہذیل کے حاجیوں کے ساتھ آیا تھا اور مکّے میں عبد بن حارث بن زہرہ بن کلاب کے پاس ٹھہرا تھا۔ ان دونوں میں سسرالی رشتہ تھا۔ وہ موسم حج ختم ہونے تک اپنے سسرالی رشتے داروں کے پاس مقیم رہا۔ جب وہ اپنے وطن واپس جانے لگا تو اس نے اپنے میزبان (عبد بن حارث) سے کہا:

"تم اتنا خیال نہیں کرتے کہ سرزمین ہذیل میں گئے ہوئے تمہیں عرصہ دراز ہوگیا؟ ہمارے ہاں تمہاری ایک بیٹی ہے جس کا تم پر کچھ حق ہے اور تمہاری اس بیٹی کی بھی ایک بیٹی ہے جس کا حق تم پر اس کی ماں سے کم نہیں۔"

یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو کہ مجھے ہذیل کی بستی میں گئے عرصۂ دراز ہوگیا اور ہم پر ان دونو بیٹیوں کا واقعی بڑا حق ہے۔ لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس جنگ نے ہمارے اور بنی قیس کے تعلقات میں بعض وجوہ سے فرق ڈال دیا ہے اور باوجود اس کے کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال چکی ہے اور ہمارے معاملات دھیرے دھیرے اپنی اصلی حالت پر واپس آرہے ہیں مگر قریش نجد کا رُخ بڑی احتیاط اور حفاظتی سامان کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم قریش ہو۔ حرم کے رہنے والے۔ اور بیت اللہ کے محافظ ہو۔ خوفزدہ تمہارے درمیان آکر امن حاصل کرتا ہے۔ بے پناہ تمہارے پاس آکر پناہ حاصل کرتا ہے۔ فریادی تمہارے پاس آکر مدد حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ساری سرزمین تمہارے لئے حرم ہے۔ اور کہیں تمہیں کوئی

خطرہ نہیں اور نہ کوئی دشمن حملہ آور ہو سکتا ہے۔"

"تم جو کچھ کہتے ہو یہ بھی صحیح ہے لیکن دیکھتے ہو کہ قیس ہماری سرزمین میں آکر جنگ کرتے ہیں اور ہمارے حرم کا کوئی احترام قائم نہیں رکھتے۔ پس اگر انکے حلیف یوں چھاپا ماریں تو ایک قریشی کو کون امن دے گا؟"

(غصّے میں آکر) تم ایسی باتیں کرتے ہو حالانکہ ہذیل سے تمہارا سُسرالی رشتہ ہے۔ تم اور یہ گفتگو کرو دراں حالیکہ تمہاری دو بیٹیاں ہمارے پاس ہیں؟"

"تمہارا رحمی رشتہ قائم رہے مسعود! مجھے سرزمینِ ہذیل میں تو کوئی خوف نہیں بلکہ میرے سوا کسی اور کو بھی سرزمینِ ہذیل میں کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن ہم تمہاری سرزمین میں پہنچ ہی نہیں سکتے۔ جب تک قیس یا ان کے حلیفوں کے کسی قبیلے سے ہو کر نہ گزریں۔"

"ہے ہے اگر تم چاہتے ہو تو اپنے اور میرے درمیان معاہدۂ حلف کرو۔ جس جس جگہ ہذیل کی دسترس ہو وہاں تمہارے دشمنوں کے مقابلے میں تمہاری حفاظت ہو اور جہاں جہاں قریشی کا اثر ہو وہاں میرے دشمنوں کے مقابلے میں میری حمایت ہو۔"

"مجھے منظور ہے۔"

اس پیمانِ حلف کے بعد مسعود سرزمین ہذیل میں تنہا ہی نہیں آیا بلکہ اس کے ساتھ اس کا حلیف اور اس کا سسرالی رشتے دار عبد بن الحارث بن زہرہ بن کلاب بھی آیا۔ وہاں اپنی بیٹی ہند کو بھی دیکھا جس کا شوہر ابن عبدِ وُدّ مر چکا تھا اور اپنی بیٹی کی بیٹی اُمِ عبد کو بھی دیکھا اور اُم عبد کے چھوٹے سے بچے عبداللہ بن مسعود کو خوب چوما اور پیار کیا۔ عبدالحارث وہاں کچھ عرصہ رہ کر مکّے واپس آیا۔ مگر زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ان کے دن پورے ہو گئے اور وہ انتقال

کر گیا۔ چنانچہ اس بچے (عبداللہ بن مسعود) نے جو باپ کی طرف سے ہذلی اور ماں کی طرف سے قریشی تھا۔ سرزمینِ ہذیل میں اس طرح پرورش پائی جس طرح ان جیسے دوسرے قصباتی بچے پرورش پاتے رہے۔ یعنی اس کی زندگی نزاکت کی بہ نسبت جفاکشی سے اور فراخی کی بجائے تنگی سے زیادہ قریب تھی۔ ابھی یہ بچہ جوان ہونے والا ہی تھا کہ باپ مر گیا۔ اور اس کی معاشی زندگی سرزمینِ نجد میں تنگ سی رہنے لگی تو مکے چلا آیا کہ اپنے بنی زہرہ کے ماموؤں کا سہارا لے۔ وہاں جبتک اللہ کو منظور ہوا اپنے ماموؤں میں اچھی طرح رہا کیونکہ ان میں اور اس کے باپ میں پیمانِ حلف بھی تو تھا۔ مکے کے سردارزادوں اور امیرزادوں کے سوا عام طور نوجوان طبقہ بے ہودہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا عادی نہ تھا۔ قریش اور اس کے حلیفوں میں متوسط درجے کے نوجوانوں کا اندازِ زیست یہ تھا کہ جب وہ محنت کر کے کھانے کے قابل ہو جاتے تو اپنی صلاحیت کے مطابق کسبِ معاش کی کوشش میں لگ جاتے۔ اس کو وہ نہ کوئی عیب سمجھتے تھے نہ کوئی گناہ۔ بلکہ سب سے بڑا عیب اور سب سے بڑا گناہ وہ اس کو سمجھتے تھے کہ ایک نوجوان اپنے باپ یا ماموں پر بوجھ بنا رہے۔

نوجوان عبداللہ بن مسعود بھی فکرِ معاش میں لگا رہتا اور ذرائع رزق کی تلاش کرتا پھرتا۔ اس نے بہت سے لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا بہت سے پیشے اختیار کئے لیکن ایک ہی کام اسے خوب بھایا جو اس کی نرم طبیعت، خوش باش دل اور فطرتِ سلیم کے مطابق نظر آیا۔ یعنی وہ عقبہ بن ابی مُعَیط کا چرواہا بن گیا۔ مکے سے باہر اس کی بکریاں چراتا۔ صبح ہوتی تو لے جاتا اور رات ہونے سے پہلے واپس لے آتا۔ وہ ان بکریوں کی گلے بانی میں راضی خوشی تنہائی میں دن گذارتا رہا۔ ادھر وہ لوگوں کے حملے سے محفوظ، اُدھر لوگ

ان کی طرف سے مطمئن۔

ایک دن وہ اپنی بکریوں کے ریوڑ میں بیٹھا تھا کہ دو آدمی آئے اور اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کے چہروں سے کچھ پریشانی نمایاں تھی جو آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ وہ دونوں اپنی تکان دور کرنے کے لئے تھوڑی دیر وہیں آرام کرتے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ان کی تلاش میں ہیں اور یہ دونو بہت چلنے کی وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں۔

یہ نوجوان (عبداللہ بن مسعود) خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور کوئی گفتگو نہ کی۔ اسے ان کے معاملے سے سروکار بھی کیا تھا؟ وہ تو اپنی بکریوں کی دنیا میں خلوت گزین ہو چکا تھا کہ نہ اسے لوگوں سے واسطہ رہے نہ لوگوں کو اس سے کچھ سروکار۔ لیکن ان دونوں میں سے ایک نے اس نوجوان سے پوچھا کہ:

"صاحبزادے! تمہارے پاس کچھ دودھ ہے جو ہمیں پلا سکو؟ ہم لوگ پیاسے ہو رہے ہیں۔"

"میں تو صرف امین ہوں، میں تمہیں دودھ نہیں پلا سکتا، ہاں اگر بکریاں میری ہوتیں تو میں ہرگز بخل نہ کرتا۔ اتنا دودھ تو ضرور حاضر کر دیتا کہ تمہاری پیاس کو تسکین ہو جاتی، تمہارا کلیجہ تر ہو جاتا۔"

ان میں سے ایک نے دوسرے کو اطمینان بھری نگاہوں سے دیکھا گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ "یہ نوجوان ٹھیک کہتا ہے اور نیکی کو مرغوب رکھتا ہے۔" اس کے بعد اس آدمی نے اپنی مطمئن نظروں سے نوجوان کو دیکھا اور کہا:

"کیا تمہارے پاس کوئی ایسی پٹھیا (چھوٹی بکری) موجود ہے جو نر سے اب تک الگ رہی ہو۔"

"ہاں ہے۔"

اس کے بعد وہ نوجوان ذرا دور چلا گیا اور ایک نوجوان بکری پکڑ لایا۔ اس مطمئن نگاہ والے شخص نے اسے چھاندا۔ پھر اس کے تھن پر ہاتھ پھیرا اور کچھ ایسے الفاظ میں دُعا کی جسے وہ نوجوان سنتا تو رہا مگر سمجھ نہ سکا۔ اس کے بعد اس نوجوان۔ دیکھا کہ تھن لبریز ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا آدمی ایک پیالے نما پتھر اُٹھا لایا۔ اس اس میں دودھ دوہا۔ ساتھی کو پلایا، پھر اس نوجوان کو پلایا اس کے بعد خود پیا۔ پھر تھن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "بس رُک جا" اور وہ پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا بکر کے چھاندے جانے سے پہلے تھا۔

نوجوان مبہوت تھا اس کی زبان پر ایسا قفل پڑ گیا کہ وہ کچھ نہ بول سکا۔ وہ حیران و ششدر کھڑا اپنی متحیر نگاہوں سے کبھی اس آدمی کو دیکھتا اور کبھی اُس آدمی کو نوجوان یوں ہی مسلسل کھڑا رہا اور وہ مطمئن نگاہ والا شخص اور اس کا ساتھی و سے اطمینان سے اُٹھے اور چل دئیے۔ انہوں نے اس نوجوان کی طرف نہ دیکھا کوئی بات کی۔ متحیر نوجوان کو کچھ نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر تک اس عالم میں گُم ر اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا کرتا رہا اور بقیہ دو دن کیا سوچتا رہا۔ بس اتنی ہے کہ جب آفتاب مغرب کی طرف اپنے دامن کو رنگ بدلتی ہوئی شعاعوں کی جھا کو جو ٹیلوں کے بالائی حصوں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی تھیں سمیٹتا ہوا جا تھا تو اس وقت اس نوجوان نے اپنے آپ کو مکّے کی طرف جاتا ہوا پایا۔ آگے آگ اس کی بکریاں تھیں جس کے لئے وہ اپنی لکڑی سے پتّیاں جھاڑتا جا رہا تھا مگر ا شغل میں نہ کوئی انہماک تھا نہ جمعیتِ خاطر۔ اس کے دل میں کچھ خیالات تھے وہ محسوس تو کر رہا تھا مگر اسے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو د کہ بکریوں کو باڑے میں داخل کر رہا ہے۔ اس کے بعد سکون کے ساتھ ق اُٹھایا مگر کچھ کھویا اور کچھ پراگندہ خیالی میں عقبہ بن ابی معیط کو ڈھونڈنے چلا۔ ا

یکھا کہ عقبہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا ہے اور اس کے گرد اس کے اہل و عیال اور دوسرے قرابتدار بیٹھے ہیں۔ یہ نوجوان ادھر لپکا اور ذرا دور پر جا کے رُک گیا اور کہنے لگا:

"ابو الولید! کل سے آپ اپنی بکریوں کے لئے اپنے کسی غلام یا حلیف کو رکھ لیجئے۔ آج سے میں ان کو چرانے سے مستعفی ہوتا ہوں۔"

"ہے ہے اے ہذیلی نوجوان! ہماری یا ان بکریوں کی کون سی بات تجھے ناگوار گذری؟"

"مجھے نہ تو آپ ہی کی کوئی بات ناگوار گذری نہ ان بکریوں کی۔ بس میری طبیعت بکریاں چرانے سے ہٹ گئی۔"

یہ کہہ کر نوجوان نے اپنا راستہ لیا۔ نہ اس نے یہ سنا کہ اس کے جواب میں کیا کہا گیا۔ نہ اس پر دھیان دیا کہ اس کے متعلق کیا گمان کیا جائے گا۔ وہ پھر لوٹ کر اس گھر میں نہ آیا بلکہ سیدھا اس جگہ جا کر ٹھہرا جہاں وہ بکریاں چرا رہا تھا۔ وہ وہاں تصوّر ہی تصوّر میں ان دو آدمیوں کو یاد کرتا رہا جن پر کچھ خوف سا طاری تھا پھر رفتہ رفتہ انہیں سکون ہوا۔ پھر اُنہوں نے اس سے دودھ مانگا اور اس نے انکار کیا۔ پھر اس کے ذہن میں وہ پٹھیا آئی جس کے تھن میں دودھ ہونے کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو سکتا تھا مگر اس کے باوجود تھن دودھ سے بھر گیا اور اسکی آنکھوں کے سامنے پیالے نما پتھر میں دودھ دوہا گیا۔ اسے اس دودھ کا مزا بھی یاد آیا جو اس نے خود بھی پیا تھا اور جس سے زیادہ لذیذ دودھ اس نے پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔ وہ بار بار اس دعائیہ کلام کو بھی یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا جو اس مطمئن نظروں والے شخص نے پڑھ کر بکری کے تھن پر ہاتھ پھیرا تھا۔ مگر وہ الفاظ اسے یاد نہ آسکے۔ پھر اس پر ایک دہشت سی طاری ہوئی اور عجب تذبذب

میں پڑ گیا اس سے پہلے کبھی کسی چیز کی ایسی تمنا اس کے دل میں نہ پیدا ہوئی تھی جیسی اس کلام کو یاد کر لینے کی ہوئی۔ حالانکہ اس کا حال یہ تھا کہ جب وہ کوئی بات سنتا تو اسے اس طرح یاد ہو جاتی تھی جیسے دل میں نقش ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے دل میں کہا، "کہ اس مطمئن نگاہ والے شخص کی اور اس کے ساتھی کی اور اس کے کلام کی بھی عجیب شان تھی" وہ نوجوان اس جگہ ساکت وصامت دیر تک کھڑا ہر طرف نگاہیں دوڑاتا رہا۔ پھر کچھ غور کئے بغیر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ یا تو وہ کچھ غور نہ کر سکا یا یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کس بات پر غور و فکر کرے۔ بس خیال ہی خیال میں کبھی تو وہ اپنے آپ کو دیکھتا اور کبھی اپنے ارد گرد اس مطمئن شخص کی خیالی صورت سامنے آجاتی جیسے وہ اس کی بکری کو چھاندرہا ہو اس کے تھن پر ہاتھ پھیر رہا ہو اور کچھ دعائیہ کلام پڑھ رہا ہو۔ وہی جو سنائی تو دیا تھا مگر سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کیا ہے اور جسے یاد کرنے کی کوشش کے باوجود اسے یاد کرنے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔

رات کے قریب وہ نوجوان وہاں سے لوٹا لیکن لوٹ کر مکّے نہ آیا بلکہ مکّے کے آس پاس ہی اپنی وحشت دور کرنے اور تنہائی تلاش کرنے کے لئے ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا۔ نہ اسے کوئی مشقّت محسوس ہو رہی تھی نہ تھکن اور نہ سو رہنے کی ضرورت۔ نہ اسے بھوک کا احساس تھا نہ پیاس کا۔ بس وہ اپنے کام و دہن میں اس دودھ کی لذّت محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اُسی مطمئن و باوقار شخص کی صورت گھوم رہی تھی اور کانوں میں وہی شیریں آواز گونج رہی تھی اور اس کا وہ نہ یاد آنے والا کلام بھی جو صاف، شفاف اور شیریں آب زلال کی طرح کسی چشمے سے جاری ہو۔ اس نوجوان کی ساری رات اس طرح گذر گئی کہ نہ سر پر کوئی سایہ تھا نہ جسم کے نیچے بستر۔ صبح کے وقت سورج چمکا

تو وہ مکّے میں اس وقت داخل ہؤا جب چرواہے مکّے سے باہر جا رہے تھے۔ وہ کسی ایک جگہ نہ ٹھہرا۔ بس چکر کاٹتا رہا اور آخر کار اس نے مطمئن شخص کو اور اس کے ساتھی کو دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ ادھر لپکا، اور محمد رسول اللّٰہ کو پالیا۔ وہ قریب آیا تو حضور نے اس کی طرف مطمئن نگاہوں سے دیکھا۔ اور مسکرا دیئے۔ نوجوان اور قریب ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ بالکل قریب پہنچ کر سامنے بیٹھ گیا۔ دھیمی اور کسی قدر مضطرب آواز سے عرض کیا کہ:

"مجھے وہ چیز سکھائیے جو میں نے کل آپ کی زبان سے سنی تھی۔"

(مسکرا کر) "تم تو خود سکھائے پڑھائے ہو صاحبزادے۔"

اس وقت اس نوجوان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ نہ اپنے لئے پیدا ہؤا ہے نہ اپنے خاندان کے لئے اور نہ عقبہ بن ابی معیط کی بکریوں کے لیئے بلکہ وہ صرف اس لئے پیدا ہؤا ہے کہ اس محمد امین کے دامن سے چمٹا رہے اس کی باتیں سُنے اور یاد کرلے اور اس کی دعوت کو پھیلائے۔

یہ نوجوان ذلاغر تھا۔ پھرتیلا اور بڑا خوش باش تھا۔ چند دن حضور کے ساتھ رہ کر باتیں سنتا اور یاد کرلیتا رہا۔ آخر کار ایک دن قریش نے دیکھا کہ وہ مکّے کے مختلف گوشوں میں جابجا محمدؐ اور ان کے کلام کا ذکر کرتا پھرتا ہے۔ اور ہر سمت اس کی اشاعت کرتا پھرتا ہے۔ ہر مجمعے میں اور ہر جگہ اس کا ذکر اور اس کی تبلیغ کرتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ نوجوان ہلکے پھلکے بدن کا اور پُھرتیلا تھا اس لئے قریش کو اس پر قابو پانے میں بڑی دُشواری ہوتی تھی۔ وہ ابھی اسے یہاں دیکھتے اور اس تک پہنچنے کا ارادہ ہی کرتے کہ وہ چپکے سے کہیں اور نکل جاتا، کسی اور جگہ نظر آتا۔ انہیں پتہ بھی نہ چلتا کہ اتنی جلدی وہاں سے یہاں کیسے آگیا۔ حضورؐ اور حضورؐ کے اصحاب کی ٹوہ میں رہنے والے لوگ اس نوجوان کو ہر جگہ دیکھتے لیکن کسی جگہ

وہ اس پر قابو نہ پا سکتے۔ آخر ایک دن ابو جہل نے کہا:

"میں محمدؐ کے کسی ساتھی سے اتنا تنگ نہیں ہؤا جتنا اس ہذلی نوجوان سے ہؤا ہوں۔ میں ہر جگہ اسے محمدی پیغام پھیلا پھیلا کر لوگوں کے خیالات خراب کرتے ہوئے دیکھتا ہوں لیکن اس پر قابو نہیں چلتا۔ اگر وہ مجھے مل جائے تو میں اسے کبھی زندہ نہ چھوڑوں۔"

عُتبہ بن ربیعہ بولا:

"ابو الحکم! ذرا سوچ لو۔ اس ہذلی نوجوان پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔ بنی زہرہ بھی اسے گوارا نہیں کرینگے۔ اگر تم نے اسے کوئی گزند پہنچائی تو سارے بنی ہذیل قریش کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے اور قریش کے تجارتی راستے کاٹ دیں گے۔ تم امن و سلامتی کے خواہش مند ہو تو ایسی ویسی بات کی خواہش نہ کرنا۔"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر میرا قابو چلا تو اس نوجوان کو مزہ چکھا کر رہوں گا۔"

ابو جہل کو اس نوجوان پر قابو پانے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ ہاں بالکل آخری وقت میں جب کہ حضورؐ نے اپنے اصحاب کو ہجرتِ حبشہ کی اجازت دی تو ابو جہل کو ایک موقع مل گیا۔ واقعہ یوں ہؤا کہ ابو جہل ایک دن مسجد حرام کے قریب سے گزر رہا تھا اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک لاغر و کمزور شخص کے گرد حلقہ باندھے جمع ہیں۔ اسے خیال ہؤا کہ وہ شخص ان لوگوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اور وہ لوگ سُن رہے ہیں۔ ابو جہل وہیں سے پلٹا اور جُھک کر دیواروں کے سہارے چپکے چپکے چلا اور مجمعے کے قریب چُھپ کر اس طرح بیٹھ گیا کہ وہ سب کو دیکھتا رہے مگر لوگ اسے نہ دیکھ سکیں۔ وہاں اس کمزور و لاغر انسان کی آواز سننے لگا اس کی آواز میں مٹھاس تھی۔ اور وہ کچھ شیریں کلام پڑھ رہا تھا۔ ابو جہل ہمہ تن

گوش ہوکر اس شیریں آواز اور شیریں کلام کو سننے لگا۔ یہ وہی نوجوان عبداللہ بن مسعود تھا جو اپنے گرد جمع ہونے والوں کو سورۂ فرقان کی یہ اہم آیات سنا رہا تھا:

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا، واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما، والذین یبیتون لربھم سجداً وقیاما، والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراما، انھا ساءت مستقراً ومقاما، والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما، والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون، ومن یفعل ذلک یلق اثاما، یضاعف لہ العذاب یوم القیامۃ ویخلد فیہ مھانا، الا من تاب وامن وعمل عملاً صالحاً فاولٰئک یبدل اللہ سیاتھم حسنت وکان اللہ غفوراً رحیما، ومن تاب وعمل صالحاً فانہ یتوب الی اللہ متابا، والذین لا یشھدون الزور واذا مروا باللغو مروا کراما،

(ترجمہ) خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب ان کو نادان لوگ مخاطب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہہ دیتے ہیں۔ اور جو اپنی راتیں اللہ کے لئے سجدہ و قیام میں گزارتے ہیں۔ اور جو یہ دعا کرتے ہیں کہ ہم سے دوزخ کے عذاب کو دور کر دے۔ اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔ اور وہ بڑا بُرا ٹھکانا ہے۔ اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل بلکہ درمیانی انداز ہوتا ہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہیں پکارتے اور کسی جاندار کو جسے اللہ نے

مارنا حرام کیا ہو بغیر کسی حق کے نہیں مارتے اور زنا نہیں کرتے۔ اور جو ایسا کرے گا
وہ بڑے گناہ کا مرتکب ہو گا۔ اللہ اسے بروز حشر دوگنی سزا دے گا۔ اور وہ
اس میں ذلت کے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔ ہاں جس نے توبہ کر لی ہو۔ اور ایمان
لے آیا ہو اور کوئی خاص نیک کام کیا ہو تو اللہ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل
کر دے گا۔ اور اللہ تو غفور و رحیم ہے۔ جو توجہ کرے اور کوئی نیک عمل کرے وہ
اللہ کے آگے خاص طور پر توبہ کرتا ہے۔ اور جو جھوٹ کے پاس بھی نہیں
جاتے اور جب کسی بے ہودہ چیز کے پاس سے گذرتے تو شریفانہ انداز
سے گذر جاتے ہیں۔

ابوجہل یہ آیات سن رہا تھا اور اس کا دل و دماغ متاثر ہو کر جھکا جا رہا
تھا۔ اگر وہ اپنے آپ کو فطرتِ سلیمہ پر چھوڑ دیتا تو وہی بات کہہ اٹھتا جو اس
مجمعے کے بعض لوگوں نے عبداللہ بن مسعود سے رکتی ہوئی سانس والی آواز
میں یوں کہا تھا کہ:

"بخدا میں یہی پسند کرتا ہوں کہ ان ہی عباد الرحمٰن میں میرا بھی شمار ہو"
مگر ابوجہل نے اپنی طبیعت کو فطرت سلیمہ پر نہ چھوڑا بلکہ اپنے حسد، بڑائی، کبر و
غرور میں ڈوبا رہا۔ چنانچہ وہ پورے مجمعے پر اس طرح جھپٹ پڑا جس طرح باز اپنے
شکار پر جھپٹتا ہے اور چلا چلا کر کہنے لگا کہ:

"بدبختو! تمہارا ستیاناس ہو۔ میں نے آج تک ایسی دیدہ دلیری کا
منظر نہیں دیکھا تھا۔ تم اس شخص کے گرد جمع ہو کر اس کی باتیں سنتے ہو حالانکہ
قریش کے مجمعے تم سے زیادہ دور نہیں۔ تم ہمارے پاس مسجد میں آکر حلقہ
کیوں نہیں بناتے؟"

لوگوں نے اس بدخو شخص کو دیکھا تو فوراً منتشر ہو گئے۔ اور نوجوان ابن

سعود اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہیں کھڑا رہا۔

ابوجہل غصّے میں بھرا ہوا ان کے پاس آکر کہنے لگا :

"امِّ عبد کے بیٹے خدا تجھے غارت کرے۔ تو مسلسل ہمارے حلیفوں اور غلاموں کو بہکا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اپنی اس حرکت سے تو باز نہیں آئے گا جب تک میں تیری مرمت نہ کر دوں ٹھکانے سے۔"

ابنِ مسعود نے اس کی بات کا جواب دینا تو چاہا لیکن ابوجہل نے اس کا موقع نہ دیا۔ اس نے اپنی کمان ان کے سر پر دے ماری اور انہیں ایسا زخمی کر دیا کہ چہرے پر خون بہنے لگا۔ ابنِ مسعود نے اس کی پرواہ نہ کی اور پھرتی سے ابوجہل کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھے کہ :

"جو کچھ تو نے میرے ساتھ کیا ہے وہ ابھی واپس لیتا جا۔ میں بھی آخر ہذیلی نوجوان ہوں۔"

یہ کہہ کر ایک ہاتھ سے ابوجہل کے سینے پر ایک گھونسا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے مُنہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ اور نہایت اطمینان سے وہاں سے چل دیئے۔ ابوجہل ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ سخت حیران و مبہوت کھڑا تھا۔ اسے اسکی توقع نہ تھی کہ قریش کا کوئی حلیف اتنی ہمت بھی رکھتا ہے کہ عمرو بن ہشام کے سینے پر گھونسا اور مُنہ پر تھپیڑ رسید کر دے۔ اس کا مزاج جب ذرا ٹھکانے پر آیا۔ تو اس نے ابنِ مسعود کو پکار کر کہا :

"او بکری چرانے والے! تو اپنی اس حرکت کی پاداش سے بچ نہیں سکتا۔"

ابنِ مسعود نے وہیں سے جواب دیا :

"او دشمنِ خدا! تو بھی اپنی اس حرکت کی پاداش سے بچ نہیں سکے گا۔"

دونوں اپنے اپنے ساتھیوں کے پاس گئے۔ ابنِ مسعود اصحابِ نبوی سے

ملے اور اپنی بہتی آنکھوں مگر مسکراتے ہوئے لبوں سے کہنے لگے :

"آج سے میرے لئے مکّے میں کوئی جگہ نہیں، کیونکہ میں نے ابوجہل کے طمانچہ رسید کر دیا۔ بخدا میں ہجرت سے خوش ہوں۔ مگر اس سے مجھے افسوس بھی ہجرت میں ثواب اور مغفرت تو ہے مگر اللہ کے رسول سے ابدی یا عارضی جدا ہے"

ادھر ابوجہل اپنی قوم کے مجمعے میں پہنچا۔ اس کا غرور ٹوٹا ہوا تھا اور دل شرمندہ تھا مگر اس کے باوجود اپنے غصّے اور بڑائی کا اظہار کرتا ہوا اپنی قوم یوں مخاطب ہوا :

"اے بنی مخزوم! اگر تم میں ذرا بھی غیرت کی رمق باقی ہو تو امّ عبد کے (ابنِ مسعود) کو ڈھونڈھ کر میرے حوالے کرو۔ اس نے مجھ سے ایسی بدتمیزی کی جسے اس کے خون کے سوا اب کوئی چیز دھو نہیں سکتی۔

لوگ عبداللہ بن مسعود کو اندرونِ مکّہ اور بیرونِ مکّہ ہر جگہ ڈھونڈ پھرے لیکن نہ اس نوجوان کو تلاش کر سکے نہ اس پر قابو پا سکے۔ اور نہ ابو نے اپنے اس مدِّمقابل کو کہیں دیکھا۔ دیکھا تو صرف بدر کے موقعے پر دیکھ

---

(۱۲)

سلام بن جبیر قرظی اپنی عادت کے مطابق اس سال بھی شام سے مالِ تجارت لے کر آیا تھا۔ اس میں طرح طرح کے مال و اسباب تھے۔ کچھ شامی چیزیں اہلِ جزیرہ کی مصنوعات اور کچھ وہ مال جو رومی دمشق اور بصریٰ کی طرف لے جاتے تھے اور وہاں سے یہودی اور عرب قافلے ایسے دور دراز کے علاقوں میں پھیلاتے تھے جہاں قیصر کی نہ دسترس تھی نہ حکومت۔ مثلاً نجد۔ حجاز۔ تہامہ اور یمن۔ سلام بن جبیر بنی قریظہ میں ٹھہر کر اپنے طویل سفر کی تھکن اُتارا کرتا تھا۔ اس کے بعد اپنا مختلف مال لوگوں کو دکھایا کرتا تھا۔ ادھر یثرب کے کچھ اوسی اور کچھ خزرجی اور کچھ نواحِ یثرب کے یہودی بھی مال دیکھنے اور خریدنے آگئے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں سلام بن جبیر اپنا مال کافی نفعے پر فروخت کر کے فارغ ہو گیا۔ مال کے ساتھ اس نے ایک لڑکا بھی فروخت کے لئے پیش کیا مگر عربوں نے اسے پسند نہ کیا اور یہودیوں نے اسے بہت گھٹیا چیز سمجھ کے چھوڑ دیا۔ اگر یہ غلام باقی نہ رہ جاتا تو سلام کا دل پوری طرح خوش ہوتا اور آئندہ چند مہینے بڑے اطمینان اور خوشی سے گزارتا۔ خود بھی یثرب کے قبائل میں گھومتا رہتا اور اپنے غلاموں اور حلیفوں کو بھی نواحِ یثرب کے دور دراز دیہاتوں میں عربی و یہودی قبائل کے پاس بھیجتا تاکہ ہر طرف سے مالِ تجارت سمیٹ کر سفرِ شام کے موقعے پر شام میں لے جاتا۔ مگر یہ لڑکا سانپ کے منہ میں چھچھوندر تھا اور اس کے دل میں حسرتِ فروخت کا مجسمہ بنا ہؤا تھا۔ اسے سلام نے بصریٰ میں کسی کلبی سے معمولی داموں پر خریدا تھا۔ اور اپنے دل میں یہ اُمید لئے بیٹھا تھا کہ اہلِ یثرب

کے ہاتھوں اسے دوگنے تین گنے داموں میں بیچ ڈالے گا۔ یثرب کے عربوں اور
یہود نے سلام سے غلاموں کی خرید و فروخت کا معاملہ نہ کیا تھا۔ لہٰذا جب انہوں
نے یہ دیکھا کہ وہ اس غلام کو بار بار اصرار سے اور ترغیب دے دے کر پیش کر
رہا ہے تو انہیں کچھ شکوک پیدا ہونے لگے اور خریدنے سے انکار کر دیا۔ ایک
شخص نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "سلام نے تو یہ غلام اپنے ہی لئے خریدا تھا۔
قرینہ یہ ہے کہ اس نے اس کے اندر کوئی نقص یا خرابی دیکھی ہوگی جس کی وجہ
سے یہ اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور جس چیز کی اسے خود ضرورت نہیں اسے ہمارے
ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے" یہ لڑکا بظاہر بیمار نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ
خرید و فروخت کرنے والوں کے ہاتھوں اس نے بڑی اذیتیں اٹھائی تھیں
یہ عربی زبان اچھی [illegible]ل سکتا تھا بلکہ اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ا
کرنے پر بھی قادر نہ تھا۔ رومی زبان بھی نہ بول سکتا تھا۔ بلکہ رومی زبان
ایک حرف بھی ادا نہ کر سکتا تھا۔ جب اس کا آقا یا کوئی دوسرا آدمی اس
گفتگو کرتا، تو وہ فارسی الفاظ کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر ادا کرتا کہ اسے کوئی
نہ پاتا۔ سلام لوگوں کو یقین دلاتا کہ اگر اس کی حالت درست ہو جائے
حسب ضرورت اسے کھانا وغیرہ ملتا رہے تو یہ لڑکا بڑا ذہین، دستکار او
خوش باش نکلے گا۔ وہ لوگوں کو یہ بھی یقین دلاتا کہ یہ فارس کے کسی شریف
گھرانے کا فرد ہے جو اصطخر سے آکر اُبلّہ میں آباد ہو گیا تھا جہاں اس خاندان
بڑی وسیع زمین پیدا کر لی تھی جس میں نبطیوں سے بٹائی پر کام لیا کرتا تھا۔ اس
بڑی وسیع تجارت بھی تھی جو اطرافِ عراق میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب سلام
ان باتوں کے علاوہ بھی کچھ مزید خاندانی حالات پوچھے جاتے تو وہ کوئی جو
نہ دے سکتا۔ صرف اتنا کہتا کہ :

"جس نے میرے ہاتھ اس لڑکے کو فروخت کیا ہے اس کا گمان ہے کہ عربوں نے جب رومیوں کے ساتھ مل کر اُبلّہ پر غارت گری کی تو عربوں نے اسے اچک لیا اور بنی کلب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور بنی کلب اسے بصرے لے گئے تاکہ کسی عرب یا یہودی تاجر کے ہاتھ فروخت کر سکیں۔ میں نے جب اسے دیکھا تو میرا دل بھر آیا اور اس کے لئے دل میں ایک کشش پیدا ہوئی اور مجھے اندازہ یہ ہوا کہ یہ کسی خاص شان کا مالک ہونے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جہاں اور مال و اسباب خریدا وہاں اسے بھی خرید لیا۔"

لوگوں نے اس وقت اس سے پوچھا کہ:

"پھر تم خود اسے پاس کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

"مجھے دراصل وہ پیسے زیادہ عزیز ہیں جو میں نے اس پر صرف کئے ہیں۔ میں ایسے لڑکے کو لے کر کیا کروں گا جسے میں اچھی طرح رکھ نہیں سکتا پھر وہ خود ہی اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ اور میری کوئی بیوی بھی نہیں جس کے سپرد اسے کر دوں۔ اس کے باوجود یہ ضرور ہے کہ اگر اس کے حالات درست ہو جائیں اور کھانے پینے کا معقول انتظام ہو تو یہ نہایت تیز، دستکار اور خوش باش نکلے گا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھو کس طرح گردش کرتی رہتی ہیں اور کسی ایک چیز پر جم کر نہیں رہ جاتیں۔ یہ نہایت تیز حس رکھتا ہے۔ اور کسی چیز کو پورے غور سے دیکھے بغیر ہی بہت کچھ حقیقت سمجھ جاتا ہے۔ ذرا اس کی آنکھوں کو دیکھو کس طرح شعلوں کی مانند چمک رہی ہیں۔"

لوگوں نے یہ باتیں سُنیں اور ہنس کر چل دیئے اور سلام کو وہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ اس نے اس لڑکے پر جو کچھ خرچ کیا تھا اور اسے نفع کی جو توقع تھی وہ حسرت بن کر دل میں چٹکیاں لیتی رہ گئی۔ ایک دن چاشت کے

وقت ثُبیتہ بنت یعار اَوسیہ سلام کے پاس سے گذری۔ اس وقت وہ یثرب کے کسی بازار میں اس لڑکے کو دکھا رہا تھا۔ ثُبیتہ نے اس لڑکے کو دیکھا تو اسے رحم آگیا۔ اس نے ابھی زیادہ دیر تک دیکھا بھی نہیں تھا کہ اس کے دل میں اسے خریدنے کی تحریک پیدا ہوگئی۔ اس نے کہا :

"ابن جبیر! اس کا نام کیا ہے ؟"

"بنی کلب کے جس شخص نے اسے میرے ہاتھ فروخت کیا ہے اس کا گمان ہے کہ اس کا نام سالم ہے۔"

"باپ کا نام ؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ جس کلبی سے میں نے اسے خریدا ہے اس کا نام معقل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کا خاندان ایک شریف گھرانہ ہے جو۔۔۔۔۔"

(بات کاٹ کر) "ہاں جو اصطخر سے آکر اُبلّہ میں آباد ہوگیا اور نبطیوں سے بٹائی پر اپنی زمین کی کاشت کراتا رہا اور اس کی تجارت بھی اطرافِ عراق میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سب باتیں ہمارے دل میں محفوظ ہیں۔ میں اسے خرید لوں گی۔ تم میرے ساتھ اسے کتنے میں فروخت کروگے ؟"

سلام کا دل اندر سے خوش ہوکر مسکرانے لگا مگر سنجیدگی اور احتیاط کو اپنے چہرے پر باقی رکھتے ہوئے بولا :

"میں نے جتنے میں اسے خریدا ہے اور اب تک جتنا اس پر خرچ کرچکا ہوں اس سے زیادہ نہیں چاہتا۔"

ان دونوں میں مسلسل مول تول ہوتا رہا اور آخر وہ اس لڑکے کو لے کر گھر آگئی۔ یہودی نے تو اچھا خاصا نفع حاصل کیا اور اس عورت نے اس بچے کو

خرید کر جو نفع حاصل کیا اس سے درہم و دینار کا کوئی مقابلہ نہیں۔

یہ اس لئے کہ اس نیک بخت نے اسے نہ تجارت کے لئے خریدا تھا نہ اس سے کسب معاش کرانے کے لیئے بلکہ اس کا مقصد اس خریداری سے صرف خیر، نیکی اور ثواب تھا۔ اس کا اور کوئی مقصود نہ تھا۔ وہ اس لڑکے کو اپنے ساتھ لیکر گھر کی طرف آرہی تھی اور اپنے آپ سے دل میں یوں باتیں کر رہی تھی۔

"تف ہے اس زندگی پر جہاں انسان دوسرے انسان پر رحم نہیں کھاتا۔ قوی کو ضعیف پر رحم نہیں آتا۔ جہاں دل نہ اس ماں پر پسیجتے ہیں جو اپنے لختِ جگر کو کھو بیٹھے اور نہ اس بچّے پر جو بڑا ہو کر نہ اپنے ماں باپ کو جانتا ہے نہ کسی ایسے رشتہ دار کو جہاں وہ پناہ لے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس طرح میرا کوئی بچّہ ہوتا اور دشمن اسے پکڑ کر کسی نامعلوم جگہ لے جاتے تو مجھے کیسا لگتا؟ میں کس طرح اسے برداشت کرتی۔ کس طرح صبر کرتی؟ کیا مجھے زندگی بھر تسکین ہوتی؟ نہیں۔ نہیں۔ اگر اس طرح میرا کوئی بچّہ ہوتا اور دشمن حملہ کر کے اسے کسی نامعلوم سرزمین میں لے جاتے تو میں دن رات اس کی یاد میں کھوئی رہتی اور سوتے جاگتے اس کو یاد کرتی۔ میرا دل اس کے پیچھے پیچھے جاتا اور اس کا حال معلوم کرنے کا تصوّر ہر جگہ کی خاک چھانتا پھرتا۔ میری زندگی کبھی مطمئن نہ ہوتی۔ نہ اس نعمتِ زندگی سے لذّت اندوز ہوتی اور نہ اس دنیا کی خوشیوں کا مجھے کوئی لطف آتا۔"

اس عورت کی چشمِ تصوّر میں اس بچّے کی وہ ماں تھی جس کی نظروں کے سامنے اس کا بچّہ چھن رہا تھا یا اس کی بے خبری میں اچک لیا گیا تھا وہ اس ماں کی حیرانی۔ تڑپ اور اس حسرت کو دیکھ رہی تھی جو کم ہونے والی نہ تھی اور ان آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی جو خشک ہونے والے نہ تھے۔ وہ لڑکے کو ساتھ لئے راستے بھر اپنے آپ سے یوں مخاطب رہی کہ:

"یہ لڑکا ہے جو کسریٰ کے ملک سے اُچک لیا گیا مگر کسریٰ کا لشکر اس کی حفاظت تک نہ کر سکا نہ دشمنوں کو بھگا سکا تو پھر ہم اہلِ یثرب کس کھیت کی مولی ہیں۔ یہ شہر تو خوف و دہشت سے گھرا ہوا ہے جس کے ہر چہار طرف یہود اور اعراب آباد ہیں۔ اس شہر میں لوگ ایک دوسرے کے خلاف تلوار کھینچ لیتے ہیں۔ اس شہر کے باشندے ہرگز مطمئن نہیں نہ جانے کب ان پر کوئی آفت کوئی مصیبت اچانک نازل ہو جائے۔"

گھر پہنچ گئی تو اطمینان سے اس بچّے کی طرف متوجّہ ہوئی۔ بچّے نے کھانا کھا کر دل سے خوف کو نکالا۔ وحشت دور ہوئی۔ اسے امن اور سکون محسوس ہوا اس کے بعد ثُبیتہ دل میں یوں باتیں کرنے لگی:

"خدا نہ کرے جو میں کوئی شادی کروں اور مجھے کوئی اولاد ہو اور اس پر بھی وہ مصیبت آئے جو اس بچّے پر آئی ہے اور میں اس کے فقدان کا وہی غم جھیلوں جو اس بچّے کی فارسی ماں اور خدا جانے کتنی ہی ایسی عورتیں جھیل رہی ہیں۔"

اگر ثبیتہ کی زندگی دراز ہوتی تو وہ اپنی ساری زندگی اس بچّے کی دیکھ بھال میں صرف کر دیتی اسے اپنا متبنّیٰ بنا لیتی۔ لیکن لوگ اپنے اندازوں اور تدبیروں پر چلتے ہیں اور زمانہ ان کے اندازوں اور تدبیروں سے الگ چلتا ہے۔

ثُبیتہ نے سالم کی طرف پوری توجہ دی یہاں تک کہ اس کے جسم کے ساتھ اس کی عقل بھی ترقی کرتی گئی اور وہ ایک ذہین، زود حس اور خوش گفتار لڑکا ہو گیا۔ یہ ویسا ہی ثابت ہوا جیسا کہ اس یہودی (سلام بن مجبیر) نے اندازہ لگایا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ نکلا۔ ثبیتہ اس سے بڑی محبت کرتی اور اس سے بہت خوش رہتی۔

بعض اوسیوں نے، بعض خزرجیوں نے اور بعض نواحی یثرب کے شرفاء نے اسے پیغام نکاح دیا مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور اپنے کہنے والوں کو اتنا عاجز کیا کہ وہ تھک ہار کے رہ گئے۔ لیکن ایک سال جب قریش کا ایک وفد شام سے واپس ہؤا تو یثرب سے گزرا اور چند دنوں کے لئے ٹھہر گیا۔ یہاں ابو حذیفہ ہشام بن عتبہ بن ربیعہ نے ثبیتہ اور اس کے غلام کا واقعہ سُنا اور سُن کر وجد و حیرت میں آگیا۔ اس کے بعد اسے کچھ اور حالات جاننے کی خواہش ہوئی اس نے ثبیتہ کی قوم میں خود جاکر اس کے مزید حالات خود ان لوگوں کی زبان سے سُنے اور اس کے دل میں بڑی قدر اس کی پیدا ہو گئی۔ حالانکہ اس نے نہ ثبیتہ کو دیکھا تھا نہ اس کی زبان سے کچھ سُنا تھا۔ صرف دوسروں سے ہی سُن کر اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ ابو حذیفہ نے ہمیشہ انکار کرنے والی ثبیتہ کو پیغام نکاح دیا جس کو پہلے تو اس نے رد کر دیا لیکن اس کے بعد اسے معلوم ہؤا کہ ابو حذیفہ قریش میں خاص وقعت رکھتا ہے بلند مرتبہ ہے اور اس گھر اور اس حرم کا رہنے والا ہے جس کی خاطر اصحاب الفیل کو دھتکار دیا گیا اور یہ وہ ہے جس پر فاجر گناہ گاروں کے سوا اور کوئی حملہ نہیں کرتا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد وہ کئی دن تذبذب میں رہی اس کے بعد اس مکّی کے پیغام نکاح کو اس نے منظور کر لیا۔ اور ابو حذیفہ ثبیتہ اور سالم کے ساتھ وفد قریش کی معیت میں مکّے لوٹ آئے۔

ابو حذیفہ مکّے میں آتو گئے لیکن وہاں بعض چیزیں انہیں کچھ غیر مانوس سی نظر آئیں۔ وہ صبح ہوتی تو قریش کے مجمعوں میں جاتے اور شام ہوتی تو جلتے لیکن جہاں انہیں بہت سی مانوس باتیں نظر آئیں وہیں اور بہت سی نامانوس باتیں بھی دکھائی دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ دل کو ویسا ہی اطمینان اور وہی امن

اور خوشی حاصل ہو جس کے وہ پہلے عادی تھے۔ لیکن وہ امن و اطمینان ان کے دل کو حاصل ہونے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ ابو حذیفہ کو یہ محسوس ہوا کہ جیسے مجموعی میں کسی چیز کی کمی آگئی ہے یا مکّے میں کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہے جس کے متعلق انہیں یہ تو علم نہیں کہ وہ کوئی معمولی سی بات ہے یا کوئی بڑا واقعہ لیکن کوئی ایسا واقعہ ضرور ہوا ہے جس نے قوم میں ایک تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس تبدیلی جسے وہ محسوس تو کرتے ہیں لیکن اس کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ ابو حذیفہ اپنے بعض دوستوں کو مجمع قریش میں تلاش کرتے مگر ان کو وہاں نہ پاتے۔ دریافت کرتے کہ عثمان بن عفّان کہاں ہیں؟ طلحہ بن عبداللہ تیمی کہاں ہیں؟ اور فلاں دوست کدھر ہیں؟" مگر لوگ کوئی صاف جواب نہ دیتے۔ بعض لوگ تو خاموش رہتے اور بعض گول مول سی باتیں بنا دیتے اور کچھ لوگ ایسا گھما کر باتیں کرتے کہ کوئی صاف مطلب نہ نکلتا۔ ابو حذیفہ یہ سب کچھ دیکھتے اور ان کا امن اور اطمینان و مسرّت کی کیفیّت ان سے اور دور ہوتی جاتی۔ پھر ایک دن ان کی آنکھ کھلی ——— اور اس اختیاط کی راہ معلوم ہو گئی۔ ان کو خیال آیا کہ ان کے یہ دوست احباب مکّے میں ہی موجود ہیں۔ نہ وہ باہر گئے ہیں اور نہ انہوں نے حرم کو چھوڑا ہے۔ پھر ان کے بارے میں کسی سے پوچھنے کی بجائے خود ان کے پاس کیوں نہ چلے چلیں؟ یہ خیال آتے ہی انہوں نے اپنے ان دوستوں کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔

پہلے وہ عثمان بن عفان کے پاس گئے۔ ابو حذیفہ اور عثمان میں اگرچہ عمر کا خاصہ تفاوت تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ عثمان کی عمر چالیس سے اوپر تھی اور ابو حذیفہ ابھی تیس کے بھی نہ ہوئے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان عرصے سے پائدار محبت چلی آ رہی تھی اور اس محبت

ہردں میں بڑی مدد ملتی تھی۔ خیر ابو حذیفہ جب عثمان کے گھر پہنچے اور اندر داخل ہوئے
سب معمول وہ اپنے دوست سے بڑی خندہ پیشانی اور تواضع سے ملے مگر ابو حذیفہ
ان تمام باتوں کے باوجود اپنے دوست کے اندر کسی قدر احتیاط اور حجاب
وس کیا۔ وہ بولے:

"ابو عمرو (عثمان) جس دن سے وفد قریش مکّے میں واپس آیا ہے اس دن
میں تمہیں قریش کے مجمعوں میں برابر تلاش کرتا رہا مگر تم نہ ملے۔ آخر کون سی
ت ایسی ہوئی جس نے تمہیں اپنی قوم میں جانے سے روک دیا؟"

"مجھے ان مجمعوں سے اور ان گفتگوؤں سے جو وہاں ہوا کرتی ہیں کوئی خوشی
یں ہوتی۔"

"کیا تمہیں اپنی قوم کی کوئی بات ناپسند ہے؟"

اس سوال کے جواب میں عثمان خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ ابو حذیفہ
نے پھر وہی سوال دہرایا۔ مگر اب کے بھی عثمان کی طرف سے مکمّل خاموشی تھی۔
حذیفہ نے کہا:

"لات و عزیٰ کی قسم اے ابو عمرو! تمہارا تو کچھ عجیب انداز ہو گیا ہے۔"

عثمان نے یہ الفاظ سنتے ہی اپنا منہ پھیر لیا۔ ابو حذیفہ نے دیکھا کہ انکے
دوست عثمان کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے اور ایسے غصّے کے آثار نمایاں
ہوئے جو ابو حذیفہ نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ:

"خدا کے لئے ابو عمرو! تم جانتے ہو کہ میرے اور تمہارے درمیان محبّت کا
رشتہ ہے اور تم میرے باوفا امانت دار دوست ہو۔ تم اپنے دل کی بات صاف
صاف کہو۔"

(بہت نرم اور شریفانہ آواز سے) اگر تم میرے اور اپنے درمیان رشتہ،

محبت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو لات و عزّیٰ کا اور دوسرے خداؤں کا ذکر نہ کرو جو تم کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔"

(ذرا دیر غصّہ و غم سے خاموش رہنے کے بعد) "ہے ہے ابو عمرو! تم یوں کہو کہ تم صابی ہو گئے۔"

(پہلے سے بھی زیادہ نرمی اور سکون سے) "ابو حذیفہ! میں صابی نہیں ہوا بلکہ ہدایت پالی ہے۔ تم تو ابھی نوجوان ہو عمر اگرچہ زیادہ نہیں ہوئی لیکن تم دنیا دیکھی ہے۔ اطرافِ عالم میں گھومے پھرے ہو۔ لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بڑے بڑے حوادث کا مقابلہ کیا ہے۔ ذرا بتاؤ کیا یہ عقل مندی ہے کہ تم جیسے یا مجھ جیسا انسان لکڑی اور پتھر کے ان بتوں پر ایمان لائے جن کو خود انسانی ہاتھوں نے بنایا ہو اور جو چاہے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے؟"

"تم ابو عمرو بات سچی اور عقل کی کہتے ہو لیکن میں نے کبھی ان چیزوں پر غور ہی نہیں کیا۔ میں نے تو اپنی قوم کو ان بتوں کی پوجا کرتے دیکھا اور وہی کچھ خود بھی کرنے لگا۔"

"اور جب ہدایت واضح ہو کر حق ثابت ہو جائے تو؟"

"تو پھر ضروری ہے کہ ہم ہدایت کی راہ پر آجائیں اور حق کی پیروی کریں۔ اچھا تو بتاؤ تم مجھے محمدؐ کے پاس کب لے چلو گے؟"

"چاہو تو ابھی چلیں۔"

ابو حذیفہ اسلام لے آئے اور اسلام لے کر ثبیتہ کے پاس گئے۔ ثبیتہ سنتے ہی محمدؐ اور ان کے پیغام پر ایمان لے آئیں۔ ان کے غلام سالم نے ان دونوں کی باتیں سنیں تو اس کا دل بھی ادھر مائل ہوا اور وہ بھی ابو حذیفہ کی طرح ایمان لے آیا۔ ابھی رات نہیں گذری تھی کہ اسلامی گھروں میں

ایک اور گھر کا اضافہ ہو گیا۔

تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ثبیتہ کو معلوم ہوا کہ محمدؐ غلام آزاد کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ اور جو لوگ غلاموں کو آزاد کرتے ہیں ان کے لئے اللہ کی طرف سے مغفرت۔ رحمت اور رضا کا وعدہ فرماتے ہیں ثبیتہ نے اپنے اس فارسی غلام کو بلایا اور کہا:

"سالم جاؤ میں نے تمہیں اللہ کے لئے آزاد کر دیا۔ جس کو چاہو اپنا مولے بنالو۔"

سالم نے ابو حذیفہ سے کہا:

"کیا آپ میرے مولے بننا پسند کریں گے؟"

ابو حذیفہ نے جواب دیا:

"میں تمہیں مولی (آزاد کردہ غلام) تو بناؤں گا نہیں۔ بلکہ آج سے تم میرے فرزند ہو گے۔

---

(۱۳)

عبداللہ بن سہیل بن عمرو اپنی بہن سہلہؓ کو دیکھنے آیا جو اپنے شوہر ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ کے پاس تھی۔ وہ آج اپنے بھائی سے ایسی معمول سے زیادہ گرم جوشی کے ملی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ملی تھی۔ اس گرم جوشی سے عبداللہ کے دل میں اس کی ایک اچھی جگہ پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی بہن سے رشتے داروں وغیرہ کے متعلق مختلف دل خوش کن اور مسرّت افزا گفتگوئیں کرتا رہا۔ کبھی وہ قریش کے سن رسیدہ بوڑھوں کی گفتگو کرتا کبھی قریش نوجوانوں کی دلچسپ باتیں۔ اسکی بہن سنتی اور خوش ہوتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی گفتگو میں شریک ہو اور اسے بچپن کی باتیں یاد دلائے لیکن وہ کچھ رُک سی جاتی اور خاموشی کو ترجیح دیتی اور بھائی کو ہی بولنے دیتی۔ عبداللہ نے دیکھا کہ اس کی بہن اس گرم جوشی اور دلچسپی کے باوجود کبھی کبھی کھو سی جاتی۔ گویا اس کا دماغ کچھ دیر کے لئے غیر حاضر سا ہو جاتا۔ اور پھر اسی جگہ آ جاتا ہے۔

اس نوجوان بھائی کو ایک ہی وقت میں بہن کی یہ دلچسپی اور غیر حاضر دماغی کچھ عجیب سی معلوم ہوئی لیکن وہ اپنی اس کیفیت کو چھپائے رہا۔ ظاہر نہ ہونے دیا اور اس کی ہنسنے ہنسانے والی باتوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ تھوڑی دیر گذر جانے کے بعد اس نے واپسی کا ارادہ کیا تو اس کی بہن اس کو دروازے تک پہنچانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عبداللہ اس کی طرف

لہ یہ ابو حذیفہ کی دوسری بیوی ہیں۔ جو ثبیتہ کے علاوہ ہیں۔ سالم یہاں بھی رہتے تھے۔

جھکنے لگا کہ اسے گلے سے لگا لے اور اسے چومے مگر وہ کچھ گھبرا کر کنارے ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو حیرت اور تعجّب کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ عبداللہؓ سابق جگہ پر واپس آ کر بیٹھ گیا۔ اور سہلہ مبہوت کھڑی رہی۔ گویا وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی کہ اب کیا کرے اور کیا کہے؟ کچھ دیر کے بعد عبداللہؓ نے کہا:

"سہلہ آج تمہارا انداز کچھ عجیب سا لگ رہا ہے! کیا تم لوگ کل ہجرت کرنے کا پکا ارادہ نہیں کر چکے ہو؟"

(انکاری انداز سے) "کیسی ہجرت؟"

(زور سے ہنس کر) "آج تک میں نے ایسی ہوشیار عورت نہیں دیکھی جو اپنے بھائی سے بھی چال چلتی ہو۔ اصحاب محمدؐ کی ہجرتِ حبشہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں۔ یہ گفتگو تو اب عام لوگوں کی محفلوں میں بھی چھڑی رہتی ہے۔ اور اکابر قریش کے مجمعوں میں بھی۔ اگر قریش چاہیں تو اصحاب محمدؐ کی ہجرت کا راستہ روک دیں۔ لیکن وہ ایسا چاہتے نہیں کیونکہ غالباً انہیں یہ ہجرت ناپسند نہیں۔ قریش محمدؐ اور ان کے ساتھیوں سے عاجز آ چکے ہیں۔ اور ان کے خلاف تدبیریں کرتے کرتے اور ان کے زیر دستوں کو مسلسل سزائیں دیتے دیتے اُکتا چکے ہیں۔ اس لئے ان کی اس ہجرت سے قریش تو خوش ہیں۔ اکابر قریش کا کہنا ہے کہ ایک مصیبت ہم سے دور ہو رہی ہے اور چین کی گھڑی ہمارے لئے آ رہی ہے۔ قریش کی آنکھیں دن رات محمدؐ اور ان کے چند ساتھیوں پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ سب قریش کے پاس رہن ہیں۔ یہ اگر جانا چاہیں تو ان کو راستہ نہیں دیا جائیگا۔ رہے زیر دست قسم کے لوگ تو قریش کو ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"

سہلہ یہ سب باتیں سنتی رہی اور اس کے چہرے سے خوف۔ غم اور خوشی کے مختلف جذبات نمایاں ہوتے رہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے بھائی کی باتیں

کھڑی سنتی رہی۔ جواب نہ دیا۔ عبداللہ پھر بولا:

"تمہارا اور تمہارے شوہر کا گمان ہے کہ قریش تم دونوں سے بے خبر ہیں۔ نہیں نہیں۔ عتبہ اور ولید بن عتبہ ابو حذیفہ کا ارادہ بھی اسی طرح جانتے ہیں جس طرح سہیل اور عبداللہ سہلہ کے ارادے سے واقف ہیں۔ تم دونوں کے معاملے کو تمہارے باپ اور بھائیوں کی طرح قریش بھی جانتے ہیں۔ مگر قریش تم دونوں کو روکیں گے نہیں۔ اس لئے کہ ان کو صرف تم دونوں کے باپ اور بھائیوں سے مطلب ہے۔ اور ہم بھی تمہیں نہ روکیں گے۔ کیونکہ ہم اس محبت کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو تمہارے لئے ہمارے دل کی گہرائیوں میں ہے اور ہم تمہاری ایسی زندگی کو پسند نہیں کرتے جس کو چھپانے اور پوشیدہ رکھنے کے لئے تمہیں طرح طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر تمہیں اس ہجرت سے خوف اور تنگی سے نجات مل جائے تو ہمیں اس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اگر قریش یہ طعنہ نہ دیتے کہ سہیل نے کمزوری دکھائی اور اپنی بیٹی کی جدائی کو برداشت نہ کر سکا تو میں تنہا تمہیں دیکھنے نہ آتا بلکہ تمہارا باپ (سہیل) بھی تمہیں اس فراق سے پہلے ــــ جس کے متعلق نہ وہ جانتا ہے نہ تم کہ یہ فراق دیرپا ہے یا مختصر۔ تم سے ملنے ضرور آجاتا۔ لیکن وہ تمہاری طرح اس فراق کو پہلا فراق تو سمجھتا ہے مگر تمہاری طرح اسے یہ نہیں معلوم کہ یہ آخری فراق بھی ہے یا نہیں۔ مجھے البتہ اس کا کچھ خیال نہیں کہ قریش میرے بارے میں کیا کہیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ میں قریش کی ناراضی میں رضا کا اور ان کے استخفاف میں مسرّت کا کوئی پہلو نکال لونگا۔ سُن لی تم نے میری بات؟"

"ہاں سُن لی؟"

"پھر اب کیا کہتی ہو؟"

"تم دیکھ رہے ہو کہ جب سے تم میرے پاس آئے ہو اس وقت سے تم ہی بول رہے ہو اور میں صرف سُن رہی ہوں۔ جواب نہیں دے رہی ہوں۔"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ میرے دل میں خود یہ خلش پیدا ہو رہی ہے کہ تم عجیب سی کیوں نظر آ رہی ہو۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ میں نے رخصت ہوتے وقت تمہیں گلے سے لگانا اور چومنا چاہا تو تم پر یہ دہشت کیسی طاری ہو گئی؟"

سہلہ اپنی شیریں مسکراہٹ کو جو اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی اور اپنی میٹھی ہنسی کو جو اس کی آواز میں پیدا ہو گئی تھی روک نہ سکی اور بولی:

"بات یہ ہے کہ تم مشرک ہو اور مشرکوں کے جسم سے مس ہونا مجھے پسند نہیں۔"

(سنجیدہ ہو کر) "کیا محمدؐ کی محبت اور ان کے دین کی قبولیت تم لوگوں میں اس حد تک ہو گئی ہے کہ اپنے بھائیوں سے بھی کٹے رہو؟"

سہلہ کی مسکراہٹ اس کے لبوں سے زائل ہو گئی اور آواز میں ایسی وقار و سنجیدگی پیدا ہو گئی کہ عبداللہ کا دل اپنی جگہ قائم نہ رہ سکا بلکہ اس کے اندر ایک مسلسل اضطراب پیدا ہو گیا۔ سہلہ نے کہا:

"اگر تمہارے اندر محمدؐ کی محبت اور ان کے دین کی قبولیت ہوتی تو تم سمجھ سکتے تھے کہ بھائیوں اور بزرگوں سے اس راہ میں کٹ جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ میرے بھائی خوب سُن لو کہ ہم اپنے ماؤں۔ باپوں اور بھائیوں سے دنیا اور اس کی ہر چیز سے بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتے ہیں۔ تم نے ابھی بیان کیا ہے کہ قریش ہماری ہجرت سے خوش ہیں لیکن سُن لو کہ ہم ان سے خوش نہیں۔ اگر محمدؐ نے ہمیں ہجرت کا حکم نہ دیا ہوتا تو ہم آزمائشوں۔ سزاؤں بلکہ موت کو بھی اپنے سکون و کشادگی۔ راحت۔ خوشی اور امن پر ترجیح دیتے۔ خواہ ان سے

قریب رہ کر ہو یا کسی حصۂ زمین میں ان سے دور رہ کر۔"

(ایک سوچ میں گردن جھکا کر) "بات تو کچھ ایسی ہے کہ محمدؐ تم لوگوں کو باپ ماؤں۔ بھائیوں۔ دنیا سے اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں حتیٰ وہ تمہاری اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔"

"اگر ہماری طرح تم بھی محمدؐ سے محبت کرتے تو تمہارا دل اس محبت کو سمجھ کہ یہ کچھ دیتی ہے لیتی نہیں۔ اور جو اپنے لئے کچھ معاوضہ یا قیمت یا جسمانی و نفسانی ل ونعمت کا مطالبہ نہیں کرتی۔"

اتنے میں ابو حذیفہ اندر داخل ہوئے اور دیکھا کہ عبداللہؓ سر جھکائے ف میں غرق ہے اور اس کی بیوی سہلہ کھڑی ہوئی اپنے بھائی کو ایسی پُر جلال ا پُر شوکت نگاہ سے دیکھ رہی ہے جس میں کچھ توقع اور کچھ نرمی بھی جھلک رہی

ابو حذیفہ نے اپنی بیوی کو بھی دیکھا۔ پھر عبداللہؓ پر نظر ڈالی۔ اور کہا:

"سہلہ! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ اللہ نے تمہارے بھائی پر سکینت قلب نازل فرمائی؟"

سہلہ نے جواب دینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ عبداللہؓ بول اُٹھا:

"سکینت؟ سکینت؟ یہ سکینت کیا بلا ہے؟ تم لوگوں کے پاس کچھ الفاظ جن کو اپنے مُنہ کے اندر گردش دیتے ہو اور وہ ہمارے کانوں کے پردے سے ٹک جاتے ہیں لیکن ان کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سہلہ تو یہ سمجھتی ہے کہ تم اپنے بزرگو بھائیوں اور اپنی جان سے بھی زیادہ محمدؐ کو عزیز رکھتے ہو اور پھر تم اس سے دریافت کرتے ہو کہ اللہ نے مجھ پر سکینتِ قلب نازل فرمائی؟ یہ سکینتِ قلب کیا بلا ہے؟ آخر یہ محمدؐ نے تمہارے دلوں کو کیا کر کے رکھ دیا ہے کہ باپ۔ بھائی او خود اپنی جانوں سے بھی زیادہ اپنا بنا لیا ہے؟"

(نرم آواز سے) "ہمارے دلوں کو محمدؐ نے اور تو کچھ نہیں کیا بجز اس کے کہ روی وگمراہی سے پاک صاف کر دیا اور وہ سکینتِ قلب بخشی جس نے دلوں کو ن۔ قوّت اور اُمید سے بھر دیا ہے اور خوف۔ شک اور مایوسی سے محفوظ کر دیا ہے۔"

اس کے بعد ابو حذیفہ نے یہ آیات تلاوت کیں :

ان الذین لا یرجون لقآ نا و رضوا بالحیٰوۃ الدنیا واطمئنوا بها والذین هم عن اٰیاتنا غافلون۔ اُولٰئك ماواهم النار بما کانوا یکسبون۔

وہ لوگ جو ہمارے سامنے پیش ہونے کا یقین نہیں رکھتے اور حیات دنیا سے خوش اور مطمئن ہیں اور ہماری آیات سے غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے آگ ہوگا۔

عبداللہ نے یہ دونوں آیتیں سنیں تو اس کے جسم پر ایک کپکپی سی طاری ہوگئی ور اس کے ماتھے سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ ابو حذیفہ نے اپنی تلاوت جاری رکھی ور اگلی آیات یوں پڑھیں :

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحت یهدیهم ربهم بایمانهم تجری من تحتهم الانهار فی جنّٰت النعیم۔ دعواهم فیها سبحانك اللّٰهم وتحیتهم فیها سلام۔ واٰخر دعواهم ان الحمد لله رب العالمین۔

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کو ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی رہنمائی فرمائے گا اور ان کے نیچے جناتِ نعیم میں نہریں جاری ہوں گی۔ وہاں ان کا نعرہ "سبحانك اللّٰهم" ہوگا اور ان کی تحیت

"سلام" اور آخری نعرہ الحمد للہ رب العالمین ہو گا۔

ان آیات پر پہنچ کر عبداللہ کی دہشت میں سکون پیدا ہُوا اور دل کو اطمینان۔ اس لئے ابو حذیفہ کو مُسکرا کر دیکھا اور بڑی شیریں اور خوش دلانہ آواز میں کہا:

"تم دونوں سے خدا سمجھے۔ یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے تمہاری سکینتِ قلب اب کچھ میرے دل کی طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ ابو حذیفہ کیا تم مجھے بھی اپنے محمدؐ کے پاس لے چلو گے کہ میں بھی ان سے وہ سکینتِ قلب حاصل کر سکوں؟

عبداللہ اسلام لے آئے اور اپنی بہن سہلہ اور بہنوئی ابو حذیفہ کے پاس واپس آکر بیٹھ گئے۔ اور دونوں سے قرآن سنتے رہے۔ رات ہوئی تو سہلہ سے پوچھا "میرے بھائی! کیا تم بھی ہمارے ساتھ ہجرت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"مجھے تم سب کا گھر چھوڑنا تو بہت شاق ہے لیکن بات یہ ہے کہ آج سے پہلے میں نے کبھی رسولِ خدا سے نہ قرآن سنا ہے نہ دوسری باتیں۔ اس لئے میں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ جب تک ممکن ہو حضورؐ کے ساتھ ہی رہوں۔ لہٰذا تم لوگ اللہ کا نام لے کر چلے جاؤ۔"

دوسرے دن صبح ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے ساتھ ابو حذیفہ بھی اپنی بیوی اور اپنے بھتیجے سالم کو لے کر روانہ ہو گئے اور جب دوسری ہجرت کا موقع آیا تو عبداللہ بن سہیل نے بھی مہاجرت میں شرکت کر لی۔

سہیل (عبداللہ کا باپ) اپنے گھر میں نہایت غمگین و دل شکستہ ہو کر بیٹھ گیا۔ قریش کو یہ محسوس ہوا کہ وہ بھی ان کے مجمعوں میں شریک نہیں ہوتا تو اس کی تلاش میں نکلے۔ عتبہ بن ربیعہ۔ شیبہ بن ربیعہ اور ابو جہل نے گھر پر آکر اس سے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اگر سہیل اپنے دل کے مشورے پر

چلتا تو ان کو اندر آنے کی اجازت نہ دیتا۔ مگر قریشی سرداروں کے اتنے حقوق تھے کہ وہ ان کو نظرانداز نہ کر سکا۔ یہ سب سہیل کے پاس پہنچے اور ابھی گفتگو شروع ہی کی تھی کہ اس کا غم اور کبیدہ خاطری محسوس ہو گئی۔

عتبہ بن ربیعہ بولا:

"ارے بھئی ابو عبداللہ! میرے بیٹے (ابو حذیفہ) نے بھی ہجرت کر لی لیکن مجھے تو اس کا کوئی غم نہیں۔"

"لیکن تمہارا یہی بیٹا تو ہے جو ہم سبھوں پر یہ مصیبت لایا ہے۔ اس نے صرف میری بیٹی (سہلہ) ہی کو نہیں بہکایا بلکہ اس کے بھائی (عبداللہ) کو بھی بہکا لیا اور دونوں کو لے کر نجاشی کے ملک میں چلا گیا۔

ابو جہل بولا:

"اگر قریش کو اتنی عقل ہوتی کہ بے وقوفوں کی مرمّت کس طرح کی جاتی ہے تو تم دونوں کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا اور اگر قریش میری مان لیتے تو میں اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک چکا ہوتا۔"

شیبہ بن ربیعہ نے کہا:

"ٹھہرو ابوالحکم (ابو جہل) ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

یہ سب لوگ سہیل کے ساتھ لگے رہے اور اسے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور جس روش پر چلنے کے پہلے عادی تھے اس پر چلتے رہے۔ اس طرح جب تک خدا کو منظور ہوا دن اور مہینے گزرتے گئے۔

حبشہ کا ایک گروہِ مہاجرین مکے میں واپس آگیا۔ ان میں کسی نے واپسی کا اظہار کر دیا اور کسی نے پوشیدہ رکھا۔ ان آنے والوں میں سہیل کا بیٹا عبداللہ بھی تھا۔ اس کا باپ (سہیل) اس سے بڑی اچھی طرح ملا اور مزے

مزے کی باتیں کرنے لگا۔ مگر عبداللہ نے ایسی بے دلی اور بے رُخی سے اپنے باپ کی گفتگو سنی گویا وہ گناہ اور معصیت کی گفتگو ہو۔ اتنے میں سہیل نے تالی بجائی اور اچانک چند مضبوط غلاموں نے آکر عبداللہ کو گھیر لیا اور باندھ کر گھر کے ایک محفوظ کمرے میں قیدی بنا کر ڈال دیا۔ اس دن سے باپ نے اپنے فرزند کو طرح طرح کی سخت اذیتیں دینی شروع کر دیں۔

(۱۴)

مکّے نے اپنی طویل تاریخ میں آج جیسا دن نہیں دیکھا تھا۔ ہاں اس کے بعد اس نے ایسے دن ضرور دیکھے جو سختی اور ناگواری میں اس سے کم نہ تھے۔ مکّہ ایک پُرامن شہر تھا۔ وہاں کے بسنے والے نہ کید و مکر سے واقف تھے نہ بغض و عناد سے آشنا۔ وہ اپنے معاملات سے بڑی خوش دلی اور اطمینان سے نپٹ لیتے تھے۔ ان میں دولت کی باہمی چشمک بھی تھی اور اعزاز و اقتدار کا مقابلہ بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہ ایک دوسرے چڑھ دوڑنے کے عادی تھے، نہ کوئی دست درازی کرتے تھے۔ ان کے معاملات سکون اور عمدگی سے چلے جا رہے تھے۔ وہاں آپس کی بڑی سے بڑی بُرائی یہ تھی کہ کوئی ایک دوسرے کو تھوڑی بہت ناگوار بات کہہ دیتا اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں درگذر سے کام لے کر وہ طرح طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ نیکیاں بھی کرتے۔ دور اور قریب کی عرب آبادی مکّے والوں کی اس خصوصیّت کو جانتی تھی۔ اس لئے ان کے دل ادھر مائل تھے۔ ان کی آرزوئیں ان سے وابستہ تھیں۔ اور ان سے خاص دلی تعلق پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کا شہر مکہ اور اس کے آس پاس کی زمین ایسا پُرامن حرم بن گیا تھا کہ خوف زدہ آدمی یہاں آکر پناہ حاصل کرتا اور فریادی آتا تو اس کی فریاد رسی ہوتی۔ لیکن آج مکّے کی صبح عجیب صبح تھی جب کہ آسمان نے اپنی مسکراہٹ دکھا کر ایک طرف تو اس کے میدانوں، پہاڑوں اور ٹیلوں کو چمکتے ہوئے سورج کی شعاعوں سے معمور کیا لیکن دوسری جانب اس مسکراہٹ میں وہ عجیب ترش روئی بھی

چھپی ہوئی تھی جس نے کچھ فرزندانِ مکّہ کو شدید تاریکیوں اور سیاہیوں سے بھر دیا تھا اور ان کو ایسی ظالمانہ تدبیر سُجھا دی تھی کہ وہاں کے بسنے والے اس سے بدتر ظلم وستم کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

آج صبح قریش کے اکابر حسب معمول مسجد حرام کے مجمعوں میں جمع ہوئے تو وہ ایسی گفتگو میں لگ گئے جس کے وہ عادی تھے۔ مگر چند ایسے آدمی بھی تھے جو مسجد کے ان مجمعوں میں شریک نہ تھے۔ ان لوگوں نے آج نہ کوئی خرید و فروخت کی بات کی نہ سیر وشکار کی۔ ان کی گفتگو کا رخ آج اس سے بالکل الگ تھا۔ آج وہ جس گفتگو میں منہمک تھے اس کا موضوع تھا "صبح کو سزاؤں کی تیاری دوپہر کو سزاؤں کا معائنہ۔ اور شام کو اس پر تبصرہ"۔ اور یہ گفتگو تنہا ان ہی اکابر کے درمیان نہ رہی بلکہ تمام قریش میں یہی چرچا تھا۔ مکّے میں کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں یاسر۔ ان کی بیوی۔ ان کے فرزند کا ذکر نہ ہو۔ صہیب خباب اور بلال کی باتیں نہ ہو رہی ہوں۔ گفتگو کا موضوع وہ رنگ رنگ کی سزائیں تھیں جو ان مظلوموں کو دی گئیں۔ سن رسیدہ اور اہلِ عقل لوگوں کی رائے یہ تھی کہ ابوجہل اور اس کی پارٹی نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ بدی کی انتہا اور سنگ دلی کی حد ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی توجیہ یہ کرتے تھے اس قسم کی سختیوں سے محمدؐ اور ان کے اصحاب ڈر کر ذرا اعتدال پر آجائیں گے ڈھیلے ہو جائیں گے۔ نیز غلاموں اور زیردستوں میں جو لوگ محمدؐ اور ان کے اصحابؓ کی طرح صابی ہو جانے والے ہونگے ان کے کان ہو جائیں گے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کو بھی ایسی ہی سزاؤں اور سرزنشوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ غرض ان بوڑھوں اور عاقلوں کے ضمیر تو اس کو پسند نہ کرتے تھے مگر دل خاموش تھے اور زبانیں تائید کر رہی تھیں۔ رہے نوجوانانِ قریش

تو وہ اس جدّت طرازی کو اپنی تفریحِ طبع اور دلچسپی کا سامان اور ایک نیا افسانہ سمجھ رہے تھے۔ اپنی عادت کے مطابق اسے محض کھیل تماشے کی ایک بات سمجھ کر لطف لے رہے تھے۔ عام طبائع میں شر کی طرف میلان، برائی سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کسی کو سزا دی جائے، اس کو اذیّت ہو۔ اس اذیّت سے تڑپنے کی حرکتیں اس سے سرزد ہوں۔ وہ فریاد کرے۔ تو عام لوگوں کو اس منظر میں لطف آتا ہے۔

نوجوانوں کے دل سخت بھی ہوتے ہیں اور ان میں ہلکا پن بھی ہوتا ہے۔ ان کی عقل جلد باز اور غصّے ور ہوتی ہے۔ وہ یہ تو دیکھتے ہیں کہ کسے جسمانی تکلیف ہوتی ہے اور وہ کیا کیا حرکتیں اور باتیں کرتا ہے۔ اس سے ان کو دلچسپی و تفریح کی تسکین ہوتی ہے ان کی آنکھوں اور دلوں کے لئے بڑا سامانِ لطف مہیّا ہوتا ہے۔ مگر وہ اس کا اندازہ بالکل نہیں کرتے اس سزا سے ان کا دوچار ہونا بھی ممکن ہے جس کے بعد ان سے بھی ایسی ہی حرکات اور ایسی ہی فریادیں سرزد ہوں اور دوسرے لوگ ان پر اسی طرح ہنسیں۔ اگر انسان ان سزاؤں کو جو دوسروں کو دی جاتی ہیں اپنے اوپر رکھ کر دیکھا کرے تو بے شمار برائیوں سے محفوظ رہے۔ نوجوانانِ قریش ابو جہل کے کمال کی داد دے رہے تھے اور ایذا رسانی کی جدّتوں پر خوش ہو رہے تھے۔ مگر ان مظلوموں نے آزمائش و محن کے موقعے پر جس صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا اس کا بڑی حیرت سے ذکر کر رہے تھے اور سزا و اذیت کے وقت ان کے جسموں میں جو اضطراری تڑپ پیدا ہوتی اس کو بڑے مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے۔

حارث بن ہشام نے اپنے بھائی (بھتیجے) عکرمہ بن ابی جہل سے کہا:

"تم نے سمیّہ کو نہیں دیکھا؟ اس پر کوڑوں کی جب بارش ہو رہی تھی تو

کس طرح اس کا جسم بل پہ بل کھا رہا تھا۔ مگر کراہنے، چلاّنے کی ایک آواز بھی اس کے منہ سے نہ نکلی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم جو کم سے کم بھی حرکتیں کریں گے تو اس سے خوف زدہ ہو جائے گی۔ وہ زمین پر کمانی کی طرح گرتی تھی اور پھر کھڑی ہو جاتی تو ہم اس کا مذاق اڑاتے تھے۔"

عکرمہ بولا:

"میں کبھی اتنا متحیر نہیں ہوا جتنا اس کے بوڑھے شوہر (یاسر) کو دیکھ کر ہوا تو کوڑے مار مار کر اس کے جسم کے ٹکڑے اڑا دئے گئے۔ اسے آگ سے داغا بھی گیا کہ ہمارے خداؤں کو نیکی سے یاد کرے لیکن میرا باپ (ابوجہل) اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے خداؤں کو جب بھی یاد کیا تو برائی اور تمسخر سے ہی یاد کیا۔ اور اس کے بیٹے عمار کا یہ حال تھا اس کی آواز اور اس کا جسم دونوں ساکن تھے۔ خاموش تھے۔ اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی جو بیک وقت شیریں بھی تھی اور زہر بھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ رضا کی مسکراہٹ تھی یا غصے کی۔ اس کی مسکراہٹ جتنی بھی اس کے لبوں پر تھی اس سے کہیں زیادہ میرے دل پر نقش ہو کے رہ گئی۔ مجھے امید نہیں یہ نقش کبھی بھی میرے دل سے مٹ سکے گا۔

صفوان بن امیہ بولا:

"کاش تم نے اس حبشی بلال کو بھی دیکھا ہوتا جب کہ آزاد و غلام نوجوان اس کے جسم پر گویا کشتی سی لڑ رہے تھے۔ ہر شخص ایک الگ سمت میں اسے اس طرح کھینچ رہا تھا جیسے وہ اس کے جسم کو تقسیم کر لینا چاہتے ہیں مگر بلال نے اس پورے عرصے میں ایک آواز بھی تو نہ نکالی۔ کوئی فریاد تک نہ کی۔ بس محمدؐ کی ثنا کرتا رہا اور اپنے خدا کا ذکر خیر کرتا رہا۔"

خالد بن ولید نے کہا:

"میں نے صہیب کی عجیب حالت دیکھی۔ لوگ آگ سے جلا رہے تھے۔ نیزوں سے کونچے لگا رہے تھے۔ جسم کو کوڑوں سے لہولہان کئے دے رہے تھے مگر وہ تھا کہ ان سے اس طرح باتیں کر رہا ہے جیسے اذیتوں اور تکلیفوں کیطرف اس کی کوئی توجہ ہی نہیں۔ بعض اوقات جب اس کو سخت تکلیف ہوتی تو تھوڑی دیر کیلئے اپنی زبان بند کرلیتا اور پیشانی پر پسینہ آجاتا۔ اس کے بعد جب دل ٹھکانے پر آتا تو سزا دینے والوں سے ان ہی کے متعلق اس طرح گفتگو کرنے لگتا جیسے انہوں نے اس سے کوئی بدسلوکی کی ہی نہیں۔ لوگ اس کو مسلسل آگ۔ لوہے اور کوڑے کی سزائیں دیتے رہے اور وہ ان کو اپنے صبر و سکون۔ ثابت قدمی اور اپنی اطمینان بھری گفتگو کی سزائیں دیتا رہا۔ جب وہ اس سے عاجز آجاتے تو اپنی سزاؤں کو اور تیز کر دیتے اور اپنی عام روش سے بھی متجاوز ہو جاتے۔ اس وقت صہیب کچھ کھو سا جاتا تھا۔ اس پر نشے سے ملتی جلتی ایک کیفیّت طاری ہو جاتی تھی وہ اس وقت بات تو کرتا تھا مگر قوم کو کچھ اُلٹی سیدھی بات کہہ دیتا۔ اس وقت قوم یہ سمجھتی کہ جو کچھ ہم چاہتے تھے وہ پورا ہو گیا۔ اس کے بعد لوگ آتشیں اور آہنی سزاؤں اور کوڑوں سے ہاتھ روک لیتے۔ بھئی میں تو اس وقت اپنی قوم سے الگ ہوں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ان لوگوں کی بعض سختیاں مجھے بھی سخت ناگوار گزریں۔"

حارث بن ہشام بولا:

"ارے چُپ رہ اگر تیرا چچا یہ بات سُن لے تو تیری بھی مرمت ہو جائیگی۔"

نوجوانانِ قریش کا یہی حال تھا وہ ان مظلوموں کے احوال سے کچھ

خوش بھی تھے اور کچھ متحیر بھی۔ کبھی تو وہ ان کی ہنسی اڑاتے اور کبھی ان پر رحم کھاتے۔

عام زیر دستوں اور غلاموں کا یہ حال تھا کہ وہ اس ظلم کو دیکھتے رہے۔ اور جب انہیں حکم دیا جاتا تو اس ظلم میں اعانت بھی کرتے۔ مگر ان کے دل اسے ناپسند کرتے تھے۔ اگرچہ زبان سے پسندیدگی ہی کا اظہار ہوتا۔ ان میں سے بہتوں کے دل خوف سے بھرے ہوئے تھے اور بعضوں کے دل میں محبت اور ڈر کی مخلوط کیفیت پیدا تھی۔ وہ موقعے کی تاک میں تھے اور منتظر تھے کہ قریش پر آفتیں نازل ہوں۔ کبھی وہ اپنے دل میں اور کبھی آپس میں تنہائی پا کر یہ کہتے کہ:

"خوبیاں تو ساری کی ساری محمدؐ اور ان کے ساتھیوں ہی کے پاس ہیں اور بھلائی اسی میں ہے کہ سب ان ہی کی طرف ہو جائیں۔ اس سے تعداد میں اضافہ ہو گا اور قوت پیدا ہو جائے گی اور کسے معلوم کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب کے ذریعے ہی اللہ شاید ان ظالموں۔ سرکشوں کے مقابلے میں ہم جیسے کمزوروں کے ساتھ کوئی انصاف فرمائے۔"

رہے وہ مسلمان جو ان سزاؤں اور آزمائشوں سے محفوظ تھے وہ بھی یہ سارے ظلم دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل میں افسوس بھی تھا اور امیدیں بھی۔ غم بھی تھا اور اعتقاد بھی۔ انہیں اطمینان تھا کہ ان مظلوموں کا انجام اچھا ہی ہو گا۔ انہیں یقین تھا کہ اللہ تعالٰی اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ پھر بھی انہیں اپنے مظلوم بھائیوں کی حالت پر اتنا رحم آتا تھا کہ بعض اوقات یہ تمنا کرنے لگتے کہ کاش ہم ان کی جگہ ہوتے اور ان کی کچھ مصیبتیں اپنے سر لے لیتے۔

اس دن شام ہونے کے بعد مکے کی جو حالت تھی اور اس کا سب سے

صحیح نقشہ جو کھینچا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مکّے کے اکثر و بیشتر لوگ عالمِ تحیّر میں تھے
انہوں نے ان سزاؤں کا منظر دیکھا مگر یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ ٹھیک ہوا یا غلط؟
انہیں یہ تمیز بھی نہ ہو رہی تھی کہ یہ خیر ہے یا شر؟ قدرے قلیل لوگ تو وہ تھے
جنہوں نے اپنے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ ان کے دل مطمئن
اور خوش تھے اور انہیں یقین بھی تھا کہ نیک انجام متقیوں کے لئے ہے۔ اہلِ مکّہ
کی آنکھوں سے اگر پردہ اُٹھ جاتا تو وہ اس دن رات آنے کے بعد ہی دیکھتے
کہ مکّے کے ارد گرد شیطانوں کی محفلِ عید منعقد ہے جہاں وہ خوشی و مسرّت
سے بدمست ہو رہے ہیں اور خوش ہو ہو کر دیکھ رہے ہیں کہ اصحابِ محمدؐ کو
سخت سے سخت سنگ دلانہ سزائیں دی جا رہی ہیں اور شیطان نے ان
لوگوں کو اللہ کے بارے میں اور اپنے بارے میں بھی فریب دے رکھا ہے۔
اس لئے وہ اس خیالِ خام میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان مظلوموں کو آزمائش
میں ڈال کر وہ مکّے پر اپنا اقتدار و تسلّط برقرار رکھیں گے اور قریش کے دلوں
میں اپنی جگہ بنالیں گے۔

صحیح نبیؐ کے اصحاب نے ان آزمائشوں کے متعلق وہ باتیں بیان کیں جو
انہیں معلوم تھیں مگر پیغمبر نے ان آزمائشوں کا ذکر فرمایا جو ان لوگوں کو معلوم
ہی نہ تھیں۔ حضورؐ اس آزمائش کے موقعے پر موجود نہ تھے اور نہ اپنی آنکھوں
سے ان آزمائشوں کو دیکھا تھا جو اصحاب کے زبردست افراد پر ڈالی گئی تھیں
بلکہ بات یہ تھی کہ آزمائش کی یہ تمام تفصیلات حضور کو بذریعۂ وحی معلوم ہو گئی
تھیں۔

پیغمبر اور آپ کے اصحاب اس کے بعد منتشر ہو کر مکّے کی گلیوں میں
پھیل گئے۔ کوئی یہاں گیا اور کوئی وہاں۔ مقصد تو بظاہر تلاشِ روزگار تھا

لیکن گمان غالب یہ تھا کہ وہ ان زیر دستوں کی ہمدردی کرنا چاہتے تھے جن کو دین سے ہٹانے کی کوشش کی جارہی تھی اور جو راہ خدا میں سزائیں سہہ رہے تھے۔ حضورؐ بھی ایک دن عثمانؓ بن عفان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مکے کے ایک میدان سے گزرے۔ چلتے چلتے ایک جگہ پہنچے جہاں خاندان یاسر کو زمین پر باندھ کر ڈال دیا گیا تھا اور ان کے سینوں پر بھاری بھاری پتھر رکھ دئے گئے تھے۔ مشرکین ان سب کو کبھی آگ سے داغتے اور کبھی خنجر اور چھرے سے کچوکے لگاتے۔ مگر یہ تھے کہ خاموش تھے اور زبان سے ایک حرف بھی نہ نکالتے۔ ان کی یہ سزا چاشت کے وقت سے مسلسل جاری تھی اور یہ اس وقت سے اب تک خاموش پڑے تھے۔ مشرکوں کو ان کی یہ مسلسل خاموشی ناگوار تھی اس لئے ایذا رسانی کو اور تیز کر دیا کہ کسی طرح آہ وفغاں پر مجبور کردیں لیکن یہ اپنی خاموشی پر قائم تھے۔ ان کے دلوں کو خدا نے صبر دے کر بے صبری کو ان سے دور کر دیا تھا۔ جب حضورؐ اور عثمانؓ ان مظلوموں کے پاس سے گذرے اس وقت پہلی بار مشرکوں نے یاسر کی آواز سنی۔ یاسر کی آواز کا رخ ان ظالموں کی طرف نہ تھا بلکہ حضورؐ کی طرف مخاطب ہو کر یاسر نے کہا:

"یارسول اللہ! زمانے کا یہی حال ہے"

حضورؐ نے فرمایا:

"آلِ یاسر! تمہیں خوش خبری ہو کہ تمہارے لئے جنّت کا وعدہ ہے"

اس وقت مشرکوں نے پہلی بار سمیّہؓ کی بھی آواز سنی۔ ان کا تخاطب بھی مشرکوں کی طرف نہ تھا۔ بلکہ حضور کی طرف تھا۔ سمیہ کے الفاظ یہ تھے:

"میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کا وعدہ سچا

ہے۔"

اسی آن مشرکوں نے عمار کے مُنہ سے بھی پہلی بار بات سُنی۔ یہ نہ اپنے والدین (یاسر و سمیہ) کی طرف مخاطب تھے نہ حضور اور عثمان کی طرف۔ ان کا روئے سخن مشرکین کی طرف تھا اور وہ کہہ رہے تھے:

"خدا کے دشمنو! تم جو کچھ چاہو ہمیں سزائیں دو۔ ہمارے لئے جنّت کا وعدہ ہے اور تم ذلیل ہو کر رہو گے۔"

اس وقت مشرکین اپنے معمول سے بھی متجاوز ہو گئے اور ان مظلوموں کو اس طرح سزائیں دینے لگے جس کی تصویر کشی کے لئے الفاظ موجود نہیں

ادھر ابو بکرؓ مکے کے ایک میدان کی طرف گئے تو دیکھا کہ بلالؓ کو سزائیں دی جا رہی ہیں سزائیں دیتے دیتے خود قریش تھک گئے تھے۔ انہیں گرم گرم ریت پر لٹا کر اوپر سے بھاری پتھر رکھ دیا گیا۔ کوشش یہ تھی کہ وہ ان کے خداؤں کو اچھے الفاظ سے یاد کریں مگر ان کی زبان سے احد احد (خدا ایک ہی ہے ایک ہی ہے) کے سوا اور کوئی لفظ نہ نکلتا تھا۔

امیہ بن خلف کہتا کہ:

"ہمارے خداؤں کو اچھے الفاظ سے یاد کرو تو یہ سزائیں رُک جائیں گی۔"

بلال جواب دیتے کہ:

"میری زبان گوارا نہیں کرتی۔"

اس کے بعد وہ پھر احد احد کہتے چلے جاتے۔

اس کے بعد اُمیہ بن خلف اور اس کے ساتھیوں نے عاجز آ کر ان کے سینے سے پتھر ہٹا دیا۔ اور انھیں کھڑا کر کے رسّی سے اس طرح باندھا کہ ایک بازو میں ایک رسّی اور دوسرے میں دوسری۔ اس کے بعد بہت سے لڑکوں

کو بلاکر ان کے ہاتھوں میں یہ رسیاں دیدیں۔ اور کہا ان کو جس قدر ممکن ہو دوڑاؤ اور تھکاؤ۔ لڑکوں نے حکم کے مطابق یہی کیا۔ کبھی وہ دائیں کھینچتے اور کبھی بائیں۔ کبھی آگے اور کبھی پیچھے۔ پھر شور مچا مچا کر ہنستے اور اُمیہ بن خلف اور اس کے ساتھی دیکھ کر مذاق اُڑاتے۔ مگر بلال کو کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ یہ ظالم انہیں جدھر لے جاتے بلال اُدھر چلے جاتے۔ نہ خلاف جاتے نہ مزاحمت کرتے۔ مگر ان کی زبان احد احد کہنے سے نہ رُکتی۔ آخر یہ لڑکے اتنے تھک گئے کہ ہانپنے لگے۔ رسی کو ڈھیلا کر کے زمین پر چھوڑ دیا اور بلال اسی طرح کھڑے احد احد کہتے رہے۔ یہ دیکھ کر امیہ اور اس کے ساتھیوں کو اور غصّہ آیا اور بلال کے سینے پر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑے۔ اس قدر زور سے گرے کہ ان کے گرنے کی زوردار آواز سنائی دی۔ مگر بلال کا احد احد اسی طرح جاری تھا۔ اُمیہ نے آگے بڑھ کر ارادہ کیا کہ ان کو پکڑ کر ان کی یہ آواز اور احد احد کی یہ آواز کسی طرح روک دے۔ اتنے میں ابو بکر درمیان میں آ گئے۔ اور فرمایا:

"تم سے خدا سمجھے۔ آخر تم اسے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟"

"ابو قحافہ کے فرزند! تمہیں اس سے کیا مطلب؟ یہ ہمارا غلام ہے ہم جو جی چاہے کریں۔"

"نہیں تمہارا غلام (عبد) ہونے سے پہلے یہ اللہ کا غلام ہے۔ اگر تم اسکی جان لوگے تو گناہ کے علاوہ خود تمہارا ہی مال ضائع ہوگا۔ کیا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا؟"

"وہ کیا؟"

"اسے میں تم سے خریدتا ہوں۔ اس کے دام بتاؤ۔"

(بلال کی سزاؤں سے عاجز آچکنے کی وجہ سے) "مجھے منظور ہے۔ تم سات وقیہ (چاندی) دے دو۔"

"اچھا تو اسے چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔ میں قیمت ادا کر دوں۔"

"پہلے قیمت ادا کرو پھر میں اسے چھوڑوں گا۔"

"خدا کی مار! تم نے مجھ سے کب کوئی ایسا معاملہ کیا ہے کہ میں نے رقم ادا کرنے میں تاخیر کی ہو؟"

(شرما کر) "یہ تو ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا تو لو اپنا غلام لے جاؤ۔ اور جب دل چاہے اس کے دام ادا کر دینا۔"

"بس گھر پہنچنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد ہی تمہاری رقم فوراً ادا ہو جائیگی۔"

ابوبکرؓ نے امیہ سے بلال کو لے لیا۔ اپنے گھر آگئے۔ اور یہاں آکر بلال کی دل جوئی کی، تسلیاں دیں۔ تکلیفیں دور کرنے کی تدبیریں کیں۔ امیہ کو قیمت بھجوا دی۔ کچھ دیر بلال سے دلجوئی کی باتیں کرتے رہے۔ آیات الٰہی پڑھ کر سناتے رہے۔ جب قاصد واپس آگیا اور معلوم ہو گیا کہ امیہ اپنے دام وصول کر چکا تو انہوں نے بلال کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا:

"بلال! جاؤ اب تم آزاد ہو۔"

اسی دن شام کو ابوبکرؓ حضورؐ سے ملے اور ان آزمائشوں کا ذکر کیا جو بلال پر ہو رہی تھیں اور یہ بھی بتایا کہ اس مصیبت سے چھڑانے کی کوئی سبیل نہ تھی اس لئے میں نے امیہ سے اسے خرید لیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"تو کیا تم نے بھی اسے باندھ ہی رکھا ہے؟"

"نہیں یا رسول اللہ! میں تو اسے آزاد بھی کر چکا ہوں۔"

کچھ اصحاب قریش کے دوسرے محلے میں چلے گئے تو وہاں انہوں نے

وہ کچھ دیکھا کہ الامان۔ وہاں ایک زبردست آگ سلگائی گئی تھی اور ایک شخص بندھا پڑا تھا۔ لوگ اسے اٹھا کر آگ سے اتنا قریب لے جاتے کہ اب جلا اب جلا۔ اس کے بعد دفعتہً وہاں سے ہٹا کر الگ کر لیتے۔ پھر اسے اسی طرح بندھا ہوا کھڑا کرتے اور کوئی آگے بڑھ کر اس کے سینے پر اس زور سے لات رسید کرتا کہ وہ اپنی پیٹھ کے بل گر پڑتا اور سب لوگ ہنسنے لگتے۔ اور پھر از سرِ نو اپنا یہی طریقہ دھراتے۔ بعض لوگ اس کو کہتے کہ ہمارے خداؤں کو اچھے الفاظ سے یاد کرو اور محمدؐ اور ان کے دین کو برا بھلا کہو ورنہ یہ آگ اور یہ زمین تمہاری جان لے کر رہے گی۔ مگر اس کی زبان سے صرف ایک ہی آواز سنائی دیتی کہ:

اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ ارسلہ بالھدیٰ ودین الحق۔

میں گواہی دیتا ہوں محمد اللہ کے رسول ہیں، جن کو اللہ نے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

وہ ظالم مسلسل اسے آگ کے قریب لے جاتے۔ پھر الگ کر لیتے پھر زمین پر دے مارتے۔ پھر اٹھا کر کھڑا کرتے۔ یہاں تک کہ اس پر غشی طاری ہو جاتی۔ اس وقت بعض لوگ یہ کہتے کہ:

"اے قریشیو اسے زندہ رہنے دو اس کی جان نہ لو ورنہ اس کے حلیف بنی زہرہ باز پرس کریں گے۔"

اصحابِ نبیؐ وہاں سے واپس آئے اور اپنے بھائیوں کو خبّاب بن ارت کے ان تمام آنکھوں دیکھے حالات سے آگاہ کیا۔ قریش اور زیردست مسلمانوں کا یہ معاملہ اسی طرح دنوں۔ مہینوں اور برسوں چلتا رہا۔ مگر قریش ان کمزوروں۔ زیردستوں کے دین میں کوئی فرق نہ ڈال سکے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ بعض کے دل میں تو کلمۂ حق پوری طرح بسا رہا مگر آزمائش

کی شدّت سے کلمہ کفر نکل آیا۔ اور بعض کو اللہ نے اپنے جوار میں جگہ دینا پسند فرمایا اور اسے مقام محمود کی نیک جزا دی۔

ایک دن قریش ٹھیک دوپہر کے وقت ایک بڑے اہم معاملہ کے لئے اکٹھا ہوئے۔ ابوجہل کو یہ زعم تھا کہ وہ یاسر اور ان کے خاندان سے جو کچھ چاہتا ہے وہ کرالے گا۔ یعنی وہ ان سب کو ایسی سزا دے گا کہ موت نظر آنے لگے گی۔ اور وہ انہیں اس وقت تک نہ چھوڑے گا جب تک قریش کے خداؤں کے حق میں کلمۂ خیر اور محمدؐ کے حق میں نامناسب کلمات نہ کہلوائے۔ عتبہ بن ربیعہ نے کہا:

"ارے ابوجہل! یاسر بڑا ہی بردبار شخص ہے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ تمہاری مرضی پوری کرنے پر موت ہی کو ترجیح دے گا۔"

"اگر ہمارے خداؤں کے حق میں کلمۂ خیر اور محمدؐ کے حق میں کلمۂ بد کہہ دے تو؟"

"ابوالحکم یہ بہت مشکل ہے اور یہ محض تمہارا خیال خام ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آج اس بوڑھے کی جان لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اچھا اور اگر وہ ہمارے خداؤں کو اچھے الفاظ اور محمدؐ کو بُرے لفظوں سے یاد کرلے تو؟"

"تو شرط رہی میں تمہیں بیس اونٹنیاں انعام دوں گا۔"

شیبہ بن ربیعہ بولا:

"اور اتنی ہی اونٹنیاں میری طرف سے بھی۔"

"تم دونوں کے لئے یہ ادا کرنا بہت سہل ہو گا۔"

"عتبہ بولا اور اگر تم نے یاسر کی جان لے لی؟"

شیبہ نے کہا "اپنی مرضی پوری کرانے سے پہلے ہی؟"

ابوجہل بولا "تو پھر تم دونوں جو فیصلہ کرو۔"

عتبہ نے جواب دیا "ہم دونوں کا کوئی فیصلہ نہیں۔ ہم اپنی طرف سے تمہارے انعام میں کوئی کمی نہیں کرینگے۔ لیکن ہمارے لئے اتنا ہی بہت ہوگا کہ تم اپنی طرف سے عداوت کا پورا اظہار کرو۔"

اس کے بعد جن لوگوں کو اس سودے بازی سے دلچسپی تھی وہ یاسر سمیہ اور عمار کی سزاؤں کو دیکھنے آگئے۔

قریش نے آج مکے میں جس قسم کی سزاؤں کا مشاہدہ کیا وہ اس سے پہلے نہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کوئی سزا ایسی نہ تھی جو انہیں اپنے مقصد میں کامیاب کردے۔ پہلے ابوجہل آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ چند ساتھی بھی تھے۔ سامنے تین کھالیں پڑی تھیں جن کو موڑ کر پانی سے بھر دیا گیا تھا دوسری طرف آگ بھڑک رہی تھی جس میں داغنے والے لوہے تپائے جا رہے تھے۔ خاندانِ یاسر کے ہر فرد کو باندھ کر سڑک کے کنارے اس طرح ڈال دیا گیا تھا جیسے کوئی بے قیمت حقیر سامان پڑا ہو۔ ابوجہل اپنے ساتھیوں کو لے کر موقع سزا پر پہنچا اور اپنے غلاموں کو حکم دیا اور انہوں نے یاسر سمیہ اور عمار کو اس کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ ان سب کی زبانوں پر مسلسل ذکرِ الٰہی جاری تھا۔ پہلے تو ان سب کو کوڑے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ اس کے بعد آگ سے داغا۔ پھر مشکیزوں سے ان پر پانی ڈالا گیا۔ پھر باری باری سے ہر ایک کے ساتھ انہیں سزاؤں کو دُھرایا گیا۔ اس کے بعد حکم کے مطابق پانی سے بھری ہوئی کھالوں میں خوب غوطے دیئے گئے ان کے دم گھٹنے لگے تو باہر نکال کر ہوا میں ڈال دیا گیا۔ اور ہوش آنے کا انتظار ہونے لگا۔ ادھر ابوجہل

کان لگا کر سننے لگا کہ دیکھیں ہوش آنے کے بعد یہ کیا کہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ یہ تینوں اس وقت بھی اللہ کی یاد اور محمدؐ کی ثنا کر رہے تھے۔ وہ غصّے میں آگ بگولا ہو گیا اور سمیہ سے بولا:

"تو ہمارے خداؤں کو اچھے الفاظ سے اور محمد کو بُرے لفظوں سے یاد کر ورنہ خوب سمجھ لے کہ اگر تو محمدؐ اور ان کے رب سے انکار نہ کرے گی تو تجھے آج کی شام دیکھنی نصیب نہ ہو گی اِس سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اُتر جائیگی۔"

(کمزور آواز میں رُک رُک کر) "ناس ہو تیرا اور تیرے خداؤں کا! میرے لئے کوئی شے اس سے عزیز نہیں جو تیرے اس منحوس چہرے کو دیکھنے سے نجات دے دے۔"

اس پر علبہ اور شیبہ نے قہقہہ لگایا اور ابوجہل غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے سمیہ کے پیٹ پر لاتیں مارنی شروع کر دیں۔ سمیہ اس وقت بھی اپنی کمزور اور رُکی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں کہ:

"ناس ہو تیرا اور تیرے جھوٹے خداؤں کا۔"

ابوجہل کا جنون اور تیز ہو گیا اور اس نے سمیہ کو برچھی سے ایسا کچو کا لگایا کہ وہ ایک ہلکی سی چیخ لگا کر رہ گئیں۔ ختم ہو گئیں۔ یہ اسلام میں سب سے پہلی شہیدہ ہے۔

یاسر بولے:

"اے دشمنِ خدا تو نے اس کی جان لے لی۔ خدا غارت کرے تجھ کو اور تیرے خداؤں کو!"

عمار نے کہا:

"اے دشمنِ خدا تو نے اس کو مار ڈالا۔ تباہ ہو جائے تو اور تیرے

سارے خدا۔ تیرا دل غصّے اور حسد کی آگ سے اور جل بُھن کے رہ جائیگا۔ رسولِ خدا نے اس مرحومہ کے لئے پہلے ہی جنّت کی بشارت دے دی تھی۔"

یاسر بولے:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔"

مگر ابوجہل نے مہلت نہ دی اور یاسر کے پیٹ پر لاتیں ماریں۔ یاسر کے مُنہ سے بھی ایک آخری چیخ نکلی اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ یہ اسلام میں دوسرے شہید ہوئے۔

عتبہ اور شیبہ نے کہا:

"ابوالحکم! تم نے ہم سے یہ شرط نہ کی تھی کہ اگر تم یاسر اور اس کی بیوی سے اپنی بات نہ منوا سکے تو......؟"

ابوجہل خاموش ہو گیا اور اکابر قریش بول اُٹھے کہ "بے شک ہم بھی اس بات کے گواہ ہیں۔"

عتبہ نے کہا:

"اس شخص (عمار) کو چھوڑ دینا چاہیئے کہ یہ اپنے والدین کو دفن تو کر دے۔"

ابوجہل واپس اپنے گھر گیا۔ اس کا دل ٹوٹا ہوا تھا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ اسے کس بات پر غصّہ آ رہا تھا؟ اس بات پر کہ یہ دونوں شہید اس سے چھن گئے اور وہ ان سے کچھ نہ کہوا سکا۔ جو وہ چاہتا تھا؟ اس بات پر کہ ان دونوں کا صبر و ثبات اور کسی فریاد و بے صبری کے بغیر موت کی طرف پیش قدمی کرنا محمدؐ اور ان کے نئے دین کی فتح ہے قریش پر اور قریشیوں کے

پرانے دین پر۔ کیونکہ اصحاب محمدؐ ان کی اور ان کے دین کی راہ میں مر جاتے ہیں اور قریش کے کمزور عوام اور سردار اور قریش کے حلیف ہیں کہ محمد کی طرف لپک رہے ہیں ان کی بات مان رہے ہیں جن میں اگرچہ زیادہ تر لوگ اخفا سے کام لیتے ہیں اور کم تر ہی ایسے ہیں جو اعلان کرتے ہیں لیکن بہرحال وہ جاتے ادھر ہی ہیں۔ اور بات بھی ان ہی کی مانتے ہیں۔ اور پھر یہ زیردست اور غلام لوگ جو پہلے اکابر قریش کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کی اطاعت کرتے تھے اور حاضر و غائب ان سے ڈرتے رہتے تھے۔ وہ اب قریش کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور ان کی سیادت و اقتدار سے انکار کرتے ہیں۔ کبھی اس کا علانیہ اظہار کرتے ہیں اور کبھی اسے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی آزاد یا غلام کو قریش پکڑ لیں تو وہ نہ ڈرتے ہیں نہ فروتنی دکھلاتے ہیں بلکہ سزا اور آزمائش کا مقابلہ یوں کرتے ہیں کہ ان کے دل خوش اور مطمئن ہوتے ہیں اور لبوں پر ایسی مسکراہٹ ہوتی ہے کہ دل جل کر رہ جاتا ہے ــــ ابوجہل کو غصّہ یا تو ان باتوں کا تھا یا اس بات کا کہ محمدؐ ان تمام سزاؤں اور آزمائشوں کو سنتے ہیں دیکھتے ہیں جو تمام قریش کے علم میں ہیں لیکن وہ نہ تو ڈرتے ہیں نہ خوف زدہ ہوتے ہیں اور نہ اپنے دینِ جدید کی تبلیغ و اشاعت سے رُکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے اصحاب کو لے کر جاتے ہیں اور اپنے سزا یافتہ پیروؤں کے ساتھ ہمدردی و غمگساری کرتے ہیں اور ان کو ایسی باتیں سمجھا دیتے ہیں جن کو یہ لوگ اپنی گرہ میں باندھ لیتے ہیں اور آزمائشوں پر ثابت قدمی و صبر کے لئے اور زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔ قریش کے ساتھ اس سے بڑا اور کون سا مذاق ہو سکتا ہے؟ یہ بعید نہیں کہ دور و قریب کے عربوں کو ان تمام باتوں کا علم ہو جائے اور کہنے لگیں کہ قریش کے پہلو میں ایک ایسا کانٹا

ہے جس نے ان کے اکابر کو، سرداروں کو اور عاقلوں کو عاجز کر رکھا ہے اور وہ اس کانٹے کو نکالنے پر قادر نہیں۔ بلکہ وہ کانٹا ان کی تدبیروں کے باوجود باقی ہے اور آس پاس بھی چھوٹے چھوٹے کانٹوں کو اُگنے کا موقع دے رہا ہے۔ اگر وہ کانٹے اپنی قوت، تیزی اور زور میں ویسے نہ بھی ہوں تو بہرحال وہ مصیبت اور آفت ضرور پھیلائیں گے اور بہت ممکن ہے کہ قریش کا سارا جسم ہی مریض ہو جائے اور پھر اس کے شفایاب ہونے کی کوئی اُمید باقی نہ رہے۔

ابوجہل کو ان تمام باتوں کا غصّہ تھا یا پھر اس بات کا کہ اکابر قریش نے دیکھ لیا کہ اس (ابوجہل) کی سختیوں نے بھی کوئی فائدہ نہ ان کو پہنچایا نہ ان کے خداؤں کو۔ بلکہ اس سختی کا نتیجہ ایسا قتل ہے جسے خود قریش پسند نہیں کرتے اور جس کی وجہ سے محمدؐ اور ان کے اصحاب میں اپنے دین سے وابستہ رہنے اور اس کی راہ میں ثابت قدم رہنے کا جذبہ اور تیز ہو گیا ـــــ یا ابوجہل کو یہ غصّہ تھا کہ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کی جیت ہو گئی اور وہ دونوں غالب رہے اور وہ (ابوجہل) جو اتنی پختگی، تیزی اور زور دکھا رہا ہے اس کی ناکامی پر ان دونوں نے اسے ملامت بھی کی۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ اس شکست کے بعد قریش کی قیادت کے لئے یہ دونوں قابلِ ترجیح ٹھہریں اور لوگوں کی دلی محبت و اطاعت کا پلّہ ان دونوں کی طرف جھک جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابوجہل کو ان تمام باتوں کا مجموعی غصّہ و رنج ہو۔ ہمیں غصّے کی صحیح وجہ نہیں معلوم۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ گھر واپس آیا تو غصّے میں بھرا ہوا تھا (وہ اپنے غصّے کو تو ظاہر کر رہا تھا لیکن اپنی شکستہ دلی کو چھپائے ہوئے تھا) اور اس کی وجہ سے اس کا مزاج اس وقت بہت بگڑا ہوا تھا۔ گھر والوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کچھ بات کرے۔ نہ اس نے کھانا کھایا نہ کسی سے بات کی۔ تنہا پڑا

رہا اور ساری رات کرب و غم اور کڑھن میں گذر گئی۔ نیند برائے نام آسکی۔

یہ تو ابوجہل تھا جو اپنے گھر گیا اور اسی طرح اپنی رات گذاری۔ ادھر عمار کو اُٹھا کر گھر پہنچا دیا گیا۔ اور ان کے والدین کو بھی پہنچا دیا گیا۔ ان تینوں کو اٹھا کر لے جانے والے مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ اس وقت وہ آپس کی رنجشیں بھول گئے تھے۔ پیش نظر یہ تھا کہ ان میں ایک مصیبت زدہ تھا جو ہمدردی کا مستحق تھا اور دو لاشیں تھیں جن کو سپرد خاک کرنا تھا۔ سب کے سب آپس میں بہت اچھے جذبۂ تعاون کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب نے عمار کی دل جوئی کی حالانکہ عمار کو اس کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ پھر سب نے ان کے والدین کو دفن کرنے میں مدد کی۔ اس کی البتہ ضرورت تھی۔

عمار اپنے والدین کو دفن کرنے کے بعد گھر واپس آیا۔ جہاں سے مشرکین تو منتشر ہو گئے —— مگر چند مسلمان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عمار کے جسم میں سزاؤں کی تکلیف اور دل میں حلاوت ایمان اور پہلو میں والدین کی جدائی کا غم صاف نمایاں تھا۔

عثمان بن عفان نے عمار سے کہا:

"والدین کا غم کیوں کرو، وہ اپنی دنیوی زندگی کا حصہ پورا کر چکے تھے اور انہوں نے خدائی انعام و رضوان کو تم سے پہلے پا لیا۔ کیا تم نے حضورؐ کا فرمان نہیں سنا۔ ایک بار تو حضورؐ نے تم سبھوں کو جنت کی بشارت دی۔ اور دوسرے موقعے پر تمہیں یہ فرما کر صبر کی تلقین کی کہ "اے اللہ آل یاسر کی مغفرت فرما۔ مغفرت تیرا کام ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو ابو عمرو! ان کا غم نہیں کرنا چاہئے۔ اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ وہ ہم سے پہلے جنت کو سدھار گئے جس کا وعدہ رسول خدا نے فرمایا

تھا اور اللہ کا وعدہ سچا ہے۔"

"اللہ اور رسول خدا نے تم سے بھی یہی وعدہ فرمایا ہے جو تمہارے والدین سے فرمایا ہے۔"

"ہائے! ابو عمرو! کاش میں بھی ان دونوں کے ساتھ رخصت ہو جاتا تو مجھے واقعی خوشی ہوتی لیکن وہ چلے گئے اور میں باقی رہ گیا۔ زندگی میں بڑی آزمائشیں ہیں اور نفس میں کمزوری ہے۔ مجھے غم صرف یہ ہے وہ دونوں تو رخصت ہو گئے میں گناہ کا ہدف بن کر باقی رہ گیا ہوں۔ ایسے گناہ کا جس کی طرف لوگ اکثر مائل ہو جاتے ہیں۔ ایسا گناہ جو عمل کو حبط کر دیتا ہے اور ایسی برائی جو نیکیوں کو ختم کر دیتی ہے۔"

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ تم اگر ہدفِ گناہ ہو تو اسی طرح عملِ صالح کا بھی ہدف ہو۔ تم جس طرح برائیوں کے لئے ہدف ہو سکتے ہو اسی طرح نیکیوں کے لئے بھی ہدف بن سکتے ہو۔ تم ایسی زندگی کو ناپسند ہرگز نہ کرو جس میں رسول اللہ موجود ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

اس کے بعد نوجوان اٹھ بیٹھا جیسے اس کو نہ کوئی تکلیف ہے نہ بیماری اور خستگی۔ گویا ایک پورے قوی انسان کی قوت ان میں لوٹ آئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور عثمان نے ساتھیوں سے کہا:

"ہمیں رسول اللہ کے پاس جانے سے کیا چیز روک رہی ہے؟"

اس پر یہ سب لوگ اٹھ کر دارِ ارقم بن ابی الارقم میں چلے گئے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حضورؐ کے پاس بیٹھ گئے۔ حضورؐ ان سب کو نصیحتیں فرماتے رہے، ان کا تزکیہ کرتے رہے اور قرآن سناتے رہے اور یہ سب لوگ سنتے رہے۔

ادھر ابوجہل نے عتبہ بن ربیعہ اور اس کے بھائی شیبہ سے کہا:
"عمار میں جو زندگی کی رمق باقی رہ گئی تھی اسے ختم ہونے سے تم ہی دونوں نے بچالیا ورنہ تم اگر معاملہ میرے اور اس کے درمیان چھوڑ دیتے تو صرف دو ہی نہیں بلکہ وہ تینوں ہی پیوند خاک ہو چکے تھے۔"

"ہم نے اے ابوالحکم تمہارے بوجھ کو ذرا ہلکا کر دیا۔"

(ایک ایسی مسکراہٹ سے جو اس کی بدنیتی کی غماز تھی) "میں نہیں چاہتا کہ میرا دشمن مر جائے کیونکہ اس سے تو وہ میرے آزار سے نجات حاصل کرلے گا۔ اور میری حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔ میں تو چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے اور میں اسے بار بار مزہ چکھاتا رہوں اور سزا کے گھونٹ ٹھہر ٹھہر کر اس کے حلق سے اتاروں۔ لات اور عزیٰ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ آج سے میرے اور عمار کے معاملے میں تم دخل نہ دینا۔ ورنہ تمہارے قبیلے اور تمام مخزومیوں کے درمیان فساد پیدا ہو جائے گا۔ یاسر ہمارا حلیف تھا اور سمیہ ہماری لونڈی اور ہم عمار کو بھی ہمیشہ اپنا غلام ہی سمجھتے رہے ہیں۔"

شیبہ: "مگر تمہارے چچا ابو حذیفہ نے تو عمار اور اس کے دونوں بھائیوں کو آزاد کر دیا تھا۔"

"بہر حال ان کی ولایت ہم ہی کو پہنچتی ہے۔"

عتبہ: "ہاں یہ بات تو ہے۔"

ابوجہل نے اپنے دل میں کچھ خاص اسکیمیں چھپا رکھی تھیں اور اللہ نے عمار کے درجے بلند کرنے کے سامان کر رکھے تھے۔ اس لئے عمار جب تک مکے میں رہے ان کی مسلسل آزمائش ہوتی رہی۔ ابوجہل نے اس آزمائش کے وہ وہ طریقے ایجاد کیے کہ وہ تاریخ کی داستانیں بن گئیں۔ سب سے پہلی

اسکیم یہ تھی کہ عمار کی زندگی اور آزادی دونوں کو محفوظ رکھا جائے۔ نہ تو اس کی جان لی جائے نہ قید خانے کی تاریکیوں میں رکھا جائے بلکہ اسے محمد اور اصحاب محمدؐ کے لئے تعزیری نمونہ بنا دیا جائے اور جب جب ضرورت ہو تعزیری کارروائی کی جائے اور جب جب تعزیر کا تماشا دیکھنے کا شوق ہو اسے سزا دی جائے۔ گویا ابوجہل نے شیطان سے یہ حلفیہ معاہدہ کر لیا تھا کہ عمار پر وہ تمام مشقِ ستم پوری کر دی جائے جو اس کے والدین کے حق میں پوری نہ ہو سکی تھی۔ جو تمنا یاسر و سمیہ سے پوری نہ کرائی جا سکی تھی وہ عمار سے پوری کرا لی جائے۔ یعنی اسے اتنا ستایا جائے کہ وہ مجبور ہو کر ابوجہل کے خداؤں کو اچھے لفظوں سے اور محمدؐ کو بُرے لفظوں سے یاد کرلے۔ اس منصوبے میں شیطان نے بھی اس کی پوری مدد کی اور قریش کے نادانوں نے کہا۔ ابوجہل نے عمارؓ کو جسمانی اور دینی دونوں حیثیتوں سے امن و عافیت کے ساتھ چھوڑ دیا۔ نہ کوئی گزند پہنچائی نہ کوئی بدسلوکی کی۔ عمار کو آزمائشوں سے چھٹکارا ملا تو انہیں گمان ہوا کہ اب امتحان و ابتلا سے اسے نجات مل گئی۔ وہ دارارقم بن ابی ارقم میں جاتے حضورؐ کی باتیں سنتے اور گفتگو کرتے اور پھر گھر واپس آتے ایک کام انہوں نے ایسا بھی کیا جو اب تک کسی مسلمان نے نہیں کیا تھا یعنی اپنے گھر میں ایک مسجد بنا لی تھی جہاں رات کا زیادہ حصہ ذکرِ الٰہی میں گزارتے تھے اور بقول ابنِ عباس انہی کے بارے میں یہ قرآنی آیت نازل ہوئی:

امن ھو قانت آناء اللیل ساجداً و قائماً یحذر الاخرة
ویرجوا رحمة ربه۔ قل ھل یستوی الذین یعلمون
والذین لا یعلمون انما یتذکر اولوا الالباب۔

یا وہ بہتر ہے جو شب کی گھڑیاں سجود و قیام میں گزارتا اور آخرت سے
ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی اُمید رکھتا ہے۔ پوچھو کہ اہلِ علم اور
بے علم برابر ہیں؟ اہلِ عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔"

ایک دن اصحابِ نبی دارِ ارقم بن ابی ارقم میں جمع تھے۔ چاشت کا وقت آگیا لیکن عمار غائب تھے۔ جب ان کا ذکر آیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ" راہِ خدا میں اس کو سزائیں دی جارہی ہیں۔" اور دن چڑھنے کے بعد حضورؐ مکّے کے ایک میدان سے گزرے تو دیکھا کہ ابوجہل اپنی اس قدیم فطرت کو دُھرا رہا ہے یعنی آگ بھڑک رہی ہے کھال کے برتن میں پانی جمع ہے اور عمار ان دونوں چیزوں کے درمیان ابتلا میں پڑا ہے۔ قریش کے کور باطن انہیں نیزوں کے کچوکے لگا رہے ہیں۔ اور آگ سے داغ رہے ہیں مگر عمار صبر کے ساتھ خاموش پڑا ہے۔ زبان چپ ہے اور دل ذکرِ الٰہی میں مصروف۔ حضورؐ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا:

یا نار کونی برداً وسلاماً علیٰ عمار کما کنتِ برداً وسلاماً
علیٰ ابراھیم۔

اے آگ ابراہیم کی طرح عمار کے لئے بھی ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔

ابوجہل نے اس طویل ابتلا کے اثنا میں عمار کے ساتھ آگ کے اتنے کھیل کھیلے جو ان کی موت کے لئے کافی تھے۔ مگر اللہ کا فرمان ہے:

ادعونی استجب لکم۔

مجھے پکارو میں جواب دوں گا

حضورؐ نے اس عمار کے لئے دعا فرمائی تھی جو خدا کا سب سے پیارا بندہ اور خدا کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب تھا۔ کامیاب حکمت اللہ ہی کے لئے

مخصوص ہے۔ اور ہر وقت کی انتہا کے لئے ایک نوشتہ ہے۔ آج عمار نے وہ تمام سزائیں جھیل لیں جن کو ایک انسان برداشت کر سکتا تھا۔ ان کو بھی اور جن کو برداشت نہیں کر سکتا تھا ان کو بھی۔ آخر جب شام ہونے لگی تو سزائیں روک کر اسے گھر رخصت کر دیا گیا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک ابوجہل نے اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ عمار کو خیال ہوا کہ اب مزید آزمائش نہ ہوگی۔ مگر ابوجہل کی یہ ڈھیل صرف اس لئے تھی کہ وہ اس سے زیادہ سخت قسم کی آزمائش اور اس سے بھی زیادہ بڑی سزا کی اسکیم بنا رہا تھا۔

حضور نے ایک دن دیکھا کہ عمار اس درجے غمگین تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ حضور بڑی دل جوئی سے اس کے پاس گئے اور آنسو پونچھنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے رہے اور فرمایا:

"ارے سمیہ کے بیٹے! تجھے کافروں نے پکڑ کر پانی میں غوطہ دیا تھا اور تیری زبان سے یہ یہ الفاظ نکلے؟ اگر وہ پھر یہی کہیں تو پھر وہی کہہ دینا۔"

لیکن کافروں نے فوراً ہی ایسا نہیں کیا بلکہ اتنی مہلت دی کہ عمار کو امن و عافیت کا یقین سا ہو جائے۔ مگر اس کے بعد اسے پکڑ کر پھر سزا و آزمائش میں ڈالا اور پھر چھوڑ دیا تو عمار حضور کی خدمت میں حاضر ہوا کہ سخت شرمندہ اور غمگین تھا چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو لگاتار گر رہے تھے۔ حضور نے دیکھا تو فرمایا:

"کیا ہوا عمار!"

(ہچکی لے لے کر) "ایک بڑے شر کا ارتکاب ہو گیا۔ خدا کی قسم ان ظالموں نے مجھے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اپنے خداؤں کے حق میں کلمۂ خیر نہ اُگلوا لیا اور حضور کے حق میں ایسے الفاظ نہ کہلوائے جو حضور کو ناپسند اور ان کو پسند ہیں۔"

"تمہارے دل کی کیا کیفیت تھی؟"

"دل تو ایمان پر بالکل مطمئن تھا۔"

"اگر وہ پھر اسی طرح مجبور کریں تو تم پھر اسی طرح اپنی جان بچا لو۔"

اس کے بعد خدا نے یہ آیت نازل فرمائی:

من کفر من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب الیم۔

جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ البتہ اس سے مستثنیٰ وہ ہے جسے مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہو۔ وہ نہیں جو شرح صدر کے ساتھ کفر کا مرتکب ہو۔

عمار کو اس ناخوشگوار آزمائش سے، جو کبھی اس پر آجاتی اور کبھی اس سے دور رہتی، اس وقت تک نجات نہ پا سکا جب تک اللہ نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت نہ دے دی۔ عمار نے اس دوسری ہجرت میں شرکت کی اور اس کے بعد پھر مدینے کی طرف ہجرت کی اور حضور کے ساتھ مکمل امن و سلامتی سے زندگی گزاری۔

---

(۱۵)

حضور نے اپنے پیغام کے لئے، اپنے ساتھیوں کے لئے اور خود اپنے لئے یثرب کے قبیلوں اوس و خزرج سے پروانہ حاصل کر لیا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ وہ حضور کو جگہ دیں۔ مدد کریں۔ پشت پناہی کریں۔ اور جو حضور پر حملہ کرے یا گزند پہنچانے کا ارادہ کرے اس سے جنگ کریں تاکہ حضور پیغام خداوندی کی تبلیغ فرماتے رہیں۔ اس معاہدے پر اوس اور خزرج کے معتمد لوگوں نے بیعت کر لی۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے رسول کو اور مسلمانوں کو اس جدید ٹھکانے کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ اسلام ان کے پہنچنے سے پہلے یثرب میں پہنچ چکا تھا۔ یہ ہجرت ایک ایسی سرزمین کی طرف تھی جہاں مہاجروں سے پہلے ہی اسلام اپنا ٹھکانا بنا چکا تھا۔ حضور نے اپنے اصحاب کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا اور وہ مختلف ٹکڑیاں بنا بنا کر اُدھر روانہ ہونے لگے مگر حضور مکّے ہی میں مقیم رہے اور انتظار کرتے رہے کہ خدا کب نکلنے کا حکم دیتا ہے۔

مسلمان مہاجرین کی یہ جماعت اپنے انصار بھائیوں کے ساتھ قبا میں جمع ہو گئی۔ اور سب لوگ حضور کی تشریف آوری کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں وہ اپنی نمازیں اس طرح ادا کرتے رہے جس طرح مکّے میں ادا کرتے تھے۔ انہوں نے نظر ڈالی تو قرآن کا سب سے بڑا عالم اور حضور سے سن کر سب سے زیادہ یاد رکھنے والا سالم بن ابی حذیفہ نظر آیا۔ اس کو لوگوں نے امامت کے لئے آگے بڑھایا۔ حالانکہ مہاجرین کے بڑے بڑے اکابر ان میں موجود تھے۔ جن کے بارے میں عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کہ عمر بن خطاب بھی موجود تھے۔

ان کا اسلام ایک فتح تھا۔ ان کی ہجرت بڑی مدد تھی۔ اور ان کی خلافت سراپا رحمت۔ اوس وخزرج کے مشرکین اور منافقین یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ مہاجرین وانصار کی یہ جماعت سالم کو امامت نماز کے لئے آگے بڑھا رہے ہیں۔ پہلے تو بظاہر سالم کو یہ لوگ کوئی "بڑا آدمی" سمجھ رہے تھے لیکن ذرا دیر میں وہ اسے پہچان کر اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا:

"اس شخص کو دیکھتے ہو جو اصحاب محمدؐ کی اس جماعت کی امامت کر رہا ہے جس میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی؟ یہ سالم ہے۔ تم سمجھے کون سالم؟"

لوگ سوچنے لگے۔ اتنے میں کسی نے اس یہودی کا واقعہ دُھرانا شروع کیا جو عربوں کے سامنے ایک ایسے کم سن لڑکے کو فروخت کے لئے پیش کر رہے تھے جو نہ عربی بول سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس واقعے کے ابتدائی چند جملے سُن کر لوگوں کو پورا واقعہ یاد آگیا کہ یہ وہی لڑکا تھا جو بیمار اور ناقابلِ توجہ تھا اور عربوں اور یہودیوں دونوں نے اسے بہت حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور ثبیتہ بنت یعار نے خوشی خوشی نہیں بلکہ رحم کھا کر اسے خرید لیا تھا۔

اور دوسرا بولا:

"آج اگر سلام بن جُبیر زندہ ہوتا تو اس لڑکے کی یہ عجیب پوزیشن دیکھتا۔"

تیسرا بولا:

"ذرا ان اصحاب محمدؐ کو تو دیکھو جن کی امامت وہ فارسی کر رہا ہے جو کل غلام تھا۔"

چوتھا اس گفتگو کے جواب میں بولا:

"ان لوگوں کی بھی عجیب حالت ہے کہ یہ غلاموں کو سردار بناتے ہیں اور آزاد و غلام کا فرق مٹاتے ہیں۔ ہمیں تو قریش پر رحم آتا ہے کیونکہ ان پر

بڑی مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ محمدؐ اور ان کے اصحاب کے ساتھ قریش نے جو کچھ بھی کیا ہے ہم ان کو اس میں معذور سمجھتے ہیں۔ اگر ہمارا بس چلے تو ہم بھی ان لوگوں کے ساتھ وہی کریں جو قریش نے کیا ہے اور ہم بھی ان سبھوں کو اپنے ملک سے اس طرح نکال باہر کریں جس طرح قریش نے کیا ہے۔ کیا اب اس کی کوئی صورت ہے؟"

پانچواں بولا:

"افسوس کہ ان لوگوں کو ہماری قوم کے قوی اور جنگ جُو افراد نے پناہ دی ہے"۔

ان گفتگو کرنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ ساری گفتگوئیں سُن کر غور و فکر کر رہے تھے اور خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد بعض لوگوں نے تنہائی ہونے پر یہی گفتگو از سرِ نو چھیڑ دی جس میں وہ اپنے تعجب کا اظہار کر رہے تھے کہ یہ شخص کل تو غلام تھا اور آج آزادوں کی امامت کر رہا ہے پھر انہوں نے مہاجرین کی حالت معلوم کی تو معلوم ہوا کہ ان میں کافی تعداد میں ایسے آزاد کردہ غلام ہیں جن کو اسلام نے آزادی بخشی۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ آزاد اور اکابر مسلمانوں کا ان لوگوں کے ساتھ جن کو غلامی کے بعد آزادی نصیب ہوئی، کیا سلوک ہے تو نظر آیا کہ یہ تو ان کے ساتھ اخوّت۔ عدل۔ انصاف اور برابری کا برتاؤ کرتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی قوم کے اسلام لانے والوں سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اسلام آزاد و غلام میں کوئی فرق نہیں رکھتا اور وہ انسانوں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا بجز اس امتیاز کے جو تقوے سے پیدا ہو یا اس نیکی۔ خیر اور عملِ صالح سے پیدا ہو جو آخرت کے لئے کیا جائے۔ یہ سن کر لوگوں کے دلوں میں اس مساوات کی طرف لپک پیدا ہونے لگی جو انہوں نے

اس سے پہلے کبھی سنی بھی نہ تھی اور وہ اس کی طرف کھنچنے لگے۔ جوان کے یہاں ناپید تھا۔ اس طرح وہ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ پھر اس کی طرف تیزی سے آئے اور پھر یہ تمنّا ہونے لگی کہ یہ سالم بن ابی حذیفہ ان کی بھی امامت کریں۔ وہی سالم جو کل تک غلام تھا اور آج جب قریش کے اور اوس و خزرج کے اکابر اللہ کے آگے نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو یہی ان کا امام بنتا ہے۔

---

(۱۶)

حضور اور آپ کے رفیق ابو بکر قبا پہنچے تو وہاں مہاجرین کے درمیان اُترے۔ حضور ہجرت مدینہ سے اور مدینہ ہجرت نبوی سے مسرور تھا۔ یہ ایک مستقل عید تھی۔ انصار حضور کی اور مہاجرین کی خدمت کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے وہ انہیں جگہ دیتے۔ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق پسندیدہ تحائف پیش کرتے۔ دوپہر کا وقت تھا، اور نماز ظہر ہو چکی تھی ایک انصاری شخص آیا اور حضور کے سامنے کھجوریں رکھ دیں۔ غالباً حضور نے اور حضور کے دونوں رفیق ابو بکر و عمر نے کھانا بھی شروع کر دیا تھا اور ایک شخص دکھائی دیا جو قریب آیا اور سلام کر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ یہ وہی صہیب تھا جو بقول نبوی رومیوں میں سب سے پہلے اسلام لایا۔

صہیب اس حال میں تھا کہ تھکا ہارا اور خستہ تھا اور تھکن انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ راستے میں آشوب چشم بھی ہو گیا تھا اور وہ مشکل ہی سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اصحاب کو سلام کر کے زمین پر پڑ گیا تھا۔ اسکی نظر اُٹھی تو کھجوروں پر جا پڑی۔ اس پر جا پڑا اور بے تحاشا کھانے لگا

عمر بن خطاب نے حضور سے مخاطب ہو کر عرض کیا:

"یا رسول اللہ صہیب کو تو دیکھئے۔ اس کو آشوب چشم ہے اور یہ کھجور کھا رہا ہے۔" (جو مضر ہے)

حضور نے صہیب سے کہا:

"تم آشوب چشم ہوتے ہوئے کھجوریں کھا رہے ہو؟"

اسی طرح بے تحاشا کھاتے ہوئے صہیب نے جواب دیا :
"حضور میں اس طرف سے کھا رہا ہوں جس طرف کی آنکھ میں آشوب نہیں ہے۔"
حضور نے اس جواب پر تبسم فرمایا اور دوسرے لوگ بھی ہنس پڑے۔ اور صہیب اسی طرح بے تحاشا کھاتے رہے۔ جب خوب سیر ہو چکے تو کچھ خفا ہوتے ہوئے ابو بکر سے بولے :
"آپ نے ساتھ رکھنے کا وعدہ کیا تھا اور مجھے چھوڑ کر چلے آئے۔"
پھر حضور سے بھی خفگی ہی کے لہجے میں بولے :
"حضور نے بھی ساتھ رکھنے کا وعدہ فرمایا تھا اور مجھے چھوڑ دیا۔ بخدا میں حضور کے پاس آنے کا اس وقت تک موقع نہ پا سکا جب تک میں نے اپنی تمام دولت کے عوض اپنا سودا نہ کر لیا۔ میں نے مکے کو صرف ایک مُد آٹے کے عوض چھوڑا ہے جسے میں نے ابوا میں گوندھا اور یہاں تک اس پر گزارا کیا۔"
حضور نے جواب دیا :
"ابو یحیٰ (صہیب) ارے تمہارا سودا بڑا نفع بخش رہا۔ بڑا ہی کامیاب۔"
پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی :

ومن الناس من یشتری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی رضا کے لئے اپنا سودا کر لیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

پھر صہیب نے اپنے کامیاب سودے کا پورا قصہ مختصر لفظوں میں سنا دیا۔ سچے مسلمانوں کا کردار یہ تھا کہ وہ بڑھ چڑھ کر باتیں نہ بناتے تھے۔

اور نہ اپنے اسلام قبول کرنے کا احسان جتاتے تھے۔ محمدؐ اور ابوبکرؓ کے ہجرت کر جانے کے بعد قریش نے بعض امور پر بڑی سختی سے عمل کیا۔ اُنہوں نے ان اصحاب محمدؐ کی جستجو کی جو مکّے میں بچ رہے تھے۔ اور ان کو ہجرت سے روکنے لگے۔ ان کو سزائیں دیتے اور اپنی آزمائش میں ڈال کر راہِ خدا سے روکتے۔ یہ صہیب بھی ان ہی لوگوں میں تھا جن کو قریش نے روک رکھا تھا۔ ابوجہل نے انتہائی غصّے میں اپنے پھڑکتے ہوئے نتھنوں کے ساتھ صہیب سے کہا:

"تم ہمارے پاس ایسے فقر و فاقہ کی حالت میں آئے تھے کہ تم دُنیا کی کسی چیز کے مالک نہ تھے۔ یہاں آکر تم نے دولت پیدا کی اور دولت مند بن گئے۔ اب تم چاہتے ہو کہ اپنا مال اور جان دونوں لے کر محمدؐ اور ان کے اصحاب کے پاس چلے جاؤ۔"

"اگر میں مال کو چھوڑ دوں تو میری ہجرت کا تم راستہ چھوڑ دو گے؟"

سب لوگوں نے اس کے جواب میں "ہاں" کہہ دی۔ مگر ابوجہل نے کہا:

"ہمیں تمہارے مال کی ضرورت، تمہاری جان کی ضرورت سے کم نہیں۔ ہم تمہیں سزاؤں میں گرفتار رکھ کر تمہارے مال پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد تمہاری جان بھی لینا چاہتے ہیں۔ ورنہ تم اپنے دین سے پھر کر اسی دین پر واپس آجاؤ جس پر پہلے تھے۔

(غمگین اور تلخ آواز سے) "اگر عبداللہ بن جدعان زندہ ہوتا تو تم میرے ساتھ یہ انداز کبھی نہ برتتے۔"

"ہم تمہیں عبداللہ بن جدعان ہی کے پاس پہنچا دیں گے۔ وہیں جا اس سے ہماری شکایت کر لینا اگر چاہو۔ کیا تم لوگوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ اس پہلی زندگی کے بعد لوگ ایک دوسری زندگی حاصل کریں گے

تو پھر جاؤ عبداللہ بن جدعان سے جا کے مل لینا اور اگر دل چاہے تو وہیں پہنچ کر اس سے ہم سبھوں کا گلہ بھی کر لینا۔"

"افسوس تو یہی ہے کہ ہم اس سے نہ مل سکیں گے کیونکہ رسولِ خدا نے مجھ سے جنّت کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ اس وقت جہنم میں ہو گا۔"

ابوجہل غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا اور صہیب پر جھپٹ پڑا۔ اور چہرے پر زور سے مار کر بولا:

"بنی تیم! تم سن رہے ہو؟ تمہارا سردار عبداللہ بن جدعان تو جہنّم میں ہے اور اس کا یہ رومی غلام جنّت میں جائے گا۔ میں نے آج تک ایسی احمقانہ اور خلافِ عقل بات نہیں سُنی تھی۔"

اس کے بعد صہیب ابوجہل کی قید میں رہا جہاں اس کو صرف اتنا کھانا ملتا تھا کہ وہ مرنے سے بچ جائے۔ مگر اس وقت مکے کے آزاد اور غلام لوگوں میں یہ غصّہ پھیل چکا تھا اس لئے ان لوگوں کی کسی تدبیر سے صہیب قید خانے سے نکل بھاگا اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر مدینے کی راہ لی۔

قریش کو خبر ملی کہ صہیب قید خانے سے نکل بھاگا اور عجب نہیں کہ وہ دسترس سے باہر نکل جائے لہٰذا انہوں نے سواروں کو پیچھے دوڑایا۔ ابھی صہیب زیادہ دور نہ گیا تھا کہ لوگوں نے ان کو جاتا ہوا دیکھ لیا۔ جب صہیب نے ان سبھوں کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھا تو یقین ہو گیا کہ اب یہ پکڑ کر آزمائش و سزا میں ڈالنے کے لئے واپس لے جائیں گے تو وہ ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے ترکش کے تمام تیر باہر نکال لئے اور ان تعاقب کرنے والوں کو زوردار آواز میں ڈپٹ کر کہا:

اے قریشیو! تم جانتے ہو میں تم سب سے بہتر تیرانداز ہوں۔ خدا کی

قسم تم میرے پاس اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک میں اپنے ترکش کے تمام تیر ختم نہ کر لوں۔ اس کے بعد بھی میں اس وقت تک تلوار چلاتا رہوں گا جب تک تلوار کا کوئی حصّہ میرے ہاتھ میں باقی ہے۔ لہٰذا اپنی موت اور میرے مال میں سے کوئی ایک چیز پسند کر لو۔ مال کا پتہ میں بتا دوں گا تم اسے جا کر لے لو اور میرا راستہ چھوڑ دو۔"

ان قریشیوں نے سوچ بچار اور رائے مشورے میں زیادہ دیر نہ لگائی۔ اُنہوں نے چُپ چاپ عافیت، سلامتی اور مال کو قبول کر لیا اور جواب میں پکار کر کہہ دیا کہ:

"ہم راضی ہیں تم اپنے مال کا پتہ ہمیں بتا دو۔"

صہیب نے ان کو اپنے مال کا پتہ بتا دیا اور وہ سب واپس چلے گئے اور صہیب اپنے راستے پر چل پڑا یہاں تک کہ رسولِ خدا کے پاس ایسی حالت میں پہنچا کہ محنت، تھکن اور بھوک پیاس سے اس کی جان پر آ بنی تھی۔

(۱۷)

عبداللہ بن مسعودؓ بھی دوسرے مہاجرین کی طرح ہجرت کرکے مدینے گیا اور معاذ بن جبل یا سعد بن خثیمہ کے پاس ٹھہرا۔ راویوں کا اس میں اختلاف ہے۔ عبداللہ اپنے میزبان کے پاس اس وقت رہا جب تک رسولِ خدا نے مدینے میں لوگوں کے محلّوں کے لئے نشان نہ ڈال دیئے۔ حضور نے بنی زہرہ کے لئے مسجدِ نبوی کے پچھلے حصّے میں نشان لگا دیئے تھے۔ ان کے ایک قبیلے نے حضور نے عرض کیا:

"ابنِ امّ عبد (عبداللہ بن مسعود) کو ہمارے پاس سے ہٹا دیجیے۔"

یہ گویا اس کو اپنے قریب رکھنا پسند کرتے تھے۔ حضور نے ان کی درخواست کا جواب دیا کہ:

"مجھے اللہ نے اور کس لئے بھیجا ہے؟ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو پسند نہیں فرماتا جو کمزور کا حق نہیں ادا کرتے۔"

اس کے بعد حضور نے ان ہی کے درمیان ابنِ مسعود کی جگہ اعزاز کے ساتھ باقی رکھی۔

عبداللہ بن مسعود کو مدینے میں آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ یہ سب سے زیادہ حضور کی خدمت میں رہنے لگا اور حضور کی عمومی و خصوصی زندگی میں سب سے زیادہ قریب۔ جب حضور گھر کے اندر جاتے تو یہ دربانی کرتا۔ جب حضور باہر نکلتے تو یہ آگے آگے چلتا۔ محدثین کے بیان کے مطابق یہ حضور کا رازدار، تکیئے والے۔ نعلین بردار اور آفتابہ بردار تھا۔ حضر میں یہ حضور کے حجرے کے پاس دربانی کرتا۔ حضور اس سے کوئی راز کی بات نہ چھپاتے۔ بجز

اس راز کے جسے پوشیدہ رکھنے کا حکم ہوا ہو۔ جب حضور باہر نکلنے کا ارادہ فرماتے تو جوتیاں پہناتا اور آگے آگے عصا لے کر چلتا۔ جب حضور بیٹھتے تو جوتیاں لے کر بغل میں رکھ لیتا۔ اور عصا حضور کو دے دیتا۔ جب حضور وہاں سے اُٹھنے کا ارادہ فرماتے تو یہ جوتیاں پہنا دیتا اور عصا لے لیتا اور اسے لے کر آگے آگے چلتا۔ جب حضور حجرے میں داخل ہونے لگتے تو یہ بڑھ کر پردہ اُٹھاتا اور حضور سے پہلے اندر داخل ہو جاتا۔ پھر جب حضور اندر تشریف لے جاتے تو یہ جوتیاں لیکر باہر آ جاتا۔ اور پردے کے باہر دربانی کرتا۔ جب حضور سفر میں نکلتے تو ابنِ مسعود سوتے وقت تکیہ رکھ دیتا۔ اور جب وضو کا ارادہ فرماتے تو یہ پانی پیش کرتا۔ جب حضور سفر میں غسل فرماتے تو یہ حضور کے لئے پردہ کھڑا کرتا۔ ابنِ مسعود کی اس وابستگی کی وجہ سے بہت سے اصحابِ نبی یہ یقین رکھتے تھے کہ ابنِ مسعود حضور کا ایک رکن خاندان ہے۔ اس لئے اگر قرآن اس کو سب سے زیادہ یاد ہو اور احادیث سب سے زیادہ سنی ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وفات نبوی کے بعد یہ شخص قرآن کی تعلیم میں سب سے بڑھ کر تھا مگر روایتِ حدیث میں سب سے کم۔ روایت حدیث میں غلطی اور گناہ کا بہت زیادہ اندیشہ لگا رہتا تھا۔ حضور اس کو بہت پسند فرماتے، بہت عزت کرتے۔ اس کی حمایت کرتے اور اس کی تعریف فرماتے حتیٰ کہ ایک دن فرمایا:

"اگر میں مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ہی کسی کو امیر بناتا تو ابنِ امِّ عبد کو بناتا۔"

ایک دن حضور نے اس کو درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے کا حکم دیا۔ وہ چڑھنے لگا تو اصحابِ نبی کو اس کی سوکھی پنڈلیاں دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ حضور نے پوچھا:

"تمہیں کس بات پر ہنسی آئی؟"

"اس شخص کی سوکھی پنڈلیاں دیکھ کر۔"

"مگر یہ میزان میں بعضوں سے زیادہ بھاری ہے۔"

یہ ہمیشہ رازدار، تکیہ بردار اور آفتابہ بردار رہا۔ جب حضور کو اللہ نے اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا اور مسلمانوں کا لشکر غزوۂ شام کے لئے روانہ ہوا تو یہ بھی غازی بن کر نکلا۔ گویا اس پر اس کے دوست (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد مدینے میں رہنا شاق تھا۔ جب تک اللہ کو منظور ہوا یہ شخص حمص میں مقیم رہا اور حضرت عمر نے اپنے دورِ خلافت میں اسے کوفے بھیج دیا۔

---

(۱۸)

جب قاصد خطرناک خبر لایا اور قریش کو یہ بتایا کہ ابوسفیان نے ان سے باہر نکل کر امداد کی فرمائش کی ہے اور یہ بتایا کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب مدینے میں اس کے قافلۂ تجارت کو روکنے والے ہیں تو قریش کے دل غصّے سے بھر گئے۔ ابھی دوپہر بھی نہ ہوئی تھی کہ قریش باہر نکل کر جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ سردارانِ قریش نے ایک دوسرے کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر اس تیاری میں حصہ لیا۔ اور ابوجہل کو یقین ہو گیا کہ جس وقت کا وہ سالہا سال سے انتظار کر رہا تھا وہ آ گیا۔ یعنی قریش محض قافلۂ تجارت کی مدد کرنے کے لئے نہیں نکل رہے ہیں بلکہ اس لئے نکل رہے ہیں کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب کو پیس کر رکھ دیں اور مکّہ و یثرب دونوں کو ان کے وجود سے پاک کر قریش کو نکل چکنے کے بعد یہ خبر مل گئی کہ ابوسفیان نے اپنے قافلے کو سمندر کے کنارے کنارے لا کر محمدؐ و اصحاب محمدؐ سے بچا لیا۔ اس وقت قریش کے لئے آسان تھا کہ وہ مکّے واپس آ جائیں اور سلامتی و عافیت کے ساتھ زندگی بسر کریں مگر اُنہوں نے نکل چکنے کے بعد واپس جانے سے انکار کر دیا۔ شیطان ابوجہل کی زبان سے ان کو سبز باغ دکھایا۔ آخر وہ بدر تک اطمینان سے گئے۔ اور عربوں کو یہ دکھلاتے رہے کہ دیکھو قریش ہنوز غلبہ و عزّت والے شرف و سیادت کے مالک ہیں۔ وہاں انہوں نے اونٹ ذبح کئے۔ خود کھایا پیا اور خوشیاں منائیں اور دوسرے عربوں کو بھی اپنے کھانے پینے کھیل تماشے میں شریک کیا۔ محمد اور اصحابِ محمد کو بھی یہی خیال پیدا ہوا کہ

کا کلمہ ابھی تک بلند ہے۔ اور قریش کا اقتدار مٹا نہیں۔ قریش سرداروں میں سہیل بن عمرو بھی میدان میں آگیا تھا۔ اس نے اپنے مال و اسباب اور مویشی اپنے فرزند عبداللہ کے حوالے کردیئے تھے جو سب کو آگے آگے لئے چلا جا رہا تھا۔ جب عبداللہ ہجرت حبشہ سے واپس آیا تو اس کے باپ سہیل نے اسے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اس کو پکڑ کے باندھ دیا تھا اور اس وقت تک قید میں رکھے رہا تھا، جب تک اسے یہ یقین نہ ہو گیا کہ اب یہ اپنے خاندانی دین پر واپس آگیا ہے اور قریش کو محمدؐ پر ترجیح دے چکا ہے۔ جب سہیل قریشی سرداروں کے ساتھ باہر نکلا تو اپنے فرزند عبداللہ کو بڑے فخر اور اعتماد سے آگے آگے رکھا۔ بدر میں دونوں طرف کی صفیں آراستہ ہوئیں۔ اور قریش نے نظر دوڑائی تو اصحابِ محمدؐ بہت تھوڑے دکھائی دیئے۔ اس لئے وہ غرور اور غلط فہمی سے پھول گئے۔ ادھر حضور نے نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ قریش سارے کے سارے اُمڈ آئے ہیں۔ حضور نے اللہ سے اپنا وعدہ پورا کرنے اور غیبی مدد نازل کرنے کی دُعا فرمائی۔ اور گریہ وزاری کرتے ہوئے فریاد کی کہ مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا۔ دونو طرف کے لشکر ایک دوسرے سے قریب آگئے۔

اس وقت قریش نے اور مسلمانوں نے دونوں نے ایک ایسا عجیب نظارہ دیکھا کہ دونوں حیرت میں آگئے۔ قریش نے دیکھا کہ ان کا ایک سب سے زیادہ قوی سب سے زیادہ شاداب جنگ جو نوجوان ان کی صف سے نکلا اور جا کر محمدؐ کی صف میں مل گیا۔ اور مسلمانوں خصوصاً مہاجروں نے یہ دیکھا کہ ان کا ایک ایسا دوست آگیا ہے جس کو وہ جانتے پہچانتے تھے اور اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ لیکن جب انہیں قریش کی طرح یہ گمان ہوا کہ وہ اپنے دین قدیم پر لوٹ آیا ہے تو انہیں صدمہ ہوا تھا۔ ادھر قریش نے اور ادھر بکثرت

مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کیا۔ یہ کون نوجوان ہے؟ اس کے بعد ہی دونوں طرف کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ عبداللہ بن سہیل بن عمرو ہے جس نے مشرکوں کو خود ان کے بارے میں اور اپنے بارے میں بھی دھوکے میں رکھا اور اس آیت سے فائدہ اُٹھایا جو اللہ نے عمار بن یاسر کے بارے میں نازل فرمائی تھی کہ "من کفر باللہ من بعد ایمانہ الخ یعنی جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور اس کیلئے دردناک سزا ہے۔ البتہ اس سے مستثنیٰ ہے وہ جسے مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہو۔ وہ نہیں جو کھلے دل سے کفر کا مرتکب ہو۔

عبداللہ کے "کفر" میں اس کا دل بالکل شریک نہ تھا اور نہ کھلے دل سے، شرح صدر کے ساتھ اُنہوں نے کفر کو قبول کیا تھا بلکہ اس کی قلبی کیفیت بالکل وہی تھی جو قریش کی ابتلا کے وقت عمار کی تھی یعنی اس کا دل ایمان پر مطمئن اور قائم تھا۔ حضور نے عمار سے فرمایا تھا کہ:

"اگر وہ پھر تمہارے ساتھ یہی سختی کریں تو تم پھر اسی طرح اپنی جان بچا لینا۔"

عبداللہ بن سہیل نے بھی اس آیت قرآنی اور فرمان رسول کا صحیح مطلب پوری طرح سمجھ لیا تھا اس لیئے جب اس کے باپ نے اسے ابتلا میں ڈالنا شروع کیا تو اس سے اور قریش سے ان کی خوشنودی کی بات کہہ دی اور خدا کی خوشنودی کی بات کو ان سے مخفی رکھا۔ یہی عبداللہ بن سہیل تھا جو اپنی قوم کی صف سے نکل کر مسلمانوں کی صف میں آیا اور آگے بڑھ کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کر کے جواب سلام کی برکت حاصل کی۔ اس کے بعد ہی صحابۂ مہاجرین کی طرف گیا اور ان کے ساتھ مل کر قریش سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہوا۔ اسی جماعت قریش سے جس میں اس کا باپ سہیل بھی

موجود تھا۔ دوران جنگ میں اس کی ملاقات ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ سے بھی ہوئی جو اس کی بہن سہلہ کا شوہر تھا جب اپنا کل قصہ بیان کیا تو تعریفی انداز میں صرف اتنا کہا کہ "بہت خوب کیا۔" دونوں طرف کے لشکر اور ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ اتنے قریب کہ تلواریں اور نیزے استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اتنے میں قریش نے اور مسلمانوں نے دونوں نے ایک اور عجیب تماشا دیکھا جس نے دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ دیکھا کہ ایک نوجوان دونوں لشکروں کے درمیان میدانِ جنگ میں کود کر آیا اور اپنے باپ عتبہ بن ربیعہ کو دعوتِ مقابلہ دینے لگا۔ عتبہ اس نوجوان سے مقابلے کے لئے آگے تو بڑھا لیکن اسے دیکھتے ہی واپس چلا گیا۔ قریش کے دل غیظ و غضب سے اور مسلمانوں کے دل حیرت و خوشی سے بھر گئے۔ دونوں نے دیکھا کہ یہ ابو حذیفہ تھا جو اپنے باپ عتبہ کو مقابلے کے لئے پکار رہا تھا۔ ابو سفیان کی بیوی اور عتبہ کی بیٹی ہند کو جب خبر ملی کہ اس کا باپ عتبہ۔ اس کا بھائی ولید اور اس کا چچا شیبہ سب مارے گئے اور اب اس کا بھائی ابو حذیفہ اپنے باپ (عتبہ) کو جنگ کے لئے پکار رہا ہے تو اس (ہند) نے اسے (اپنے بھائی ابو حذیفہ کو) بہت زیادہ برا بھلا کہا اور ابو حذیفہ کی ہجو میں یہ دو شعر کہے:

الاحول الاثعل المشؤم طائرہ   ابو حذیفۃ شر الناس فی الدین

اما شکرت اباً رباك من صغر   حتی شببت شبابًا غیر محجون

ارے او یہ کانا۔ بدہیئت دانتوں والے۔ منحوس ابو حذیفہ۔ دین میں بدترین انسان۔

ارے تو اس باپ کا بھی شکر گزار نہ ہوا جس نے تجھے بچپنے سے پال کر تجھے سیدھا جوان کیا۔

اس معرکے کے مہاجرین میں عبداللہ بن مسعود بھی تھا۔ یہ کمزور۔ دبلا۔ لاغر تھا۔ گوشت جسم پر بہت کم تھا۔ مگر خوش باش اور پھرتیلا بہت زیادہ تھا۔ ابھی یہاں دکھائی دیتا اور ابھی وہاں نظر آتا۔ لڑنے والے قریشیوں کے مقابلے میں بھی اس کا وہی انداز تھا جو مکّے میں مسلمانوں کے آزمائش میں ڈالے جانے کے وقت تھا۔ وہ کبھی ادھر دوڑتا اور کبھی اُدھر بھاگتا اور پورے میدان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتا پھرتا۔ یہی بھاگ دوڑ کرتے ہوئے اُنہوں نے عفرا کے دونوں فرزندوںؔ[1] کو دیکھا کہ ابوجہل کو پچھاڑ دیا اور اسے ایسا کاری زخم لگایا ہے کہ اب اُٹھ نہ سکتا۔ ابن مسعود لپک کر وہاں پہنچے۔ اس وقت ابوجہل میں اتنی جان باقی تھی کہ وہ دیکھ سکتا تھا۔ سن سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا اور بمشکل بول بھی سکتا تھا۔ عبداللہ بن مسعود اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور کہا:

"دشمن خدا! آخر خدا نے تجھے ذلیل و رسوا کر کے چھوڑا۔"

(دھیمی اور رکتی ہوئی آواز میں) "ارے تُو ہے بکریاں چرانے والا! تو ایک ایسی بلند جگہ پر بیٹھ گیا ہے جہاں چڑھنا بہت دشوار تھا۔"

"تو نے مسلمانوں کو جو اذیتیں پہنچائی تھیں اس کے بدلے خدا نے تجھے رسوا کیا۔ اب دنیا کے عذاب کا مزہ بھی چکھ اور آخرت کی سزا تو اس سے بھی زیادہ سخت اور عبرت ناک ہے۔"

اس کے بعد ابن مسعود نے اس کا سر کاٹ لیا اور لپکتے ہوئے حضور کے پاس آیا اور ابوجہل کے مارے جانے کی خبر سنائی۔ حضور نے فرمایا:

---

[1] معاذ اور معوذ۔

"اللہ! اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔"

عبداللہ بن مسعود نے بھی کہا کہ:

"اللہ ہی ہے اس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔"

اس کے بعد حضور نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ان تمام مسلمانوں نے بھی وہاں تھے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد قریش کے مقتول جب بدر کے گڑھے میں ڈالے گئے تو حضور وہاں ذرا دیر کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"اے گڑھے میں پڑے ہوئے مقتولو! خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ تم نے دیکھ لیا؟ میں نے تو اس وعدے کو دیکھ لیا جو میرے رب نے مجھ سے کیا تھا۔"

بعض صحابہ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! یہ تو مرے ہوئے ہیں۔"

حضور نے فرمایا:

"یہ تمہاری ہی طرح سنتے ہیں، مگر تمہاری طرح بول نہیں سکتے۔"

(۱۹)

بلال سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں تھے اور اسلام میں سب سے پہلے ان ہی نے اذان کہی تھی۔ حضورؐ نے اذان کی خدمت اس وقت ان کے سپرد کی جب مسلمانوں کی جماعت منظم ہوگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب مہاجرین وانصار میں ایسے لوگ بھی تھے جو بلال سے زیادہ بلند آواز تھے اور ایسے بھی تھے جو ان سے زیادہ صاف زبان رکھتے تھے۔ لیکن اللہ جس پر اپنا کرم کرے۔ حضور بلال کے اس اوّلیت اسلام اور اوّلیت اذان کو جانتے تھے اس لئے جب تک وہ مدینے میں مقیم رہتے اذان کی خدمت یہی انجام دیتے ـــ اور جب وہ مدینے سے باہر ہوتے تو ان کی جگہ ابو محذورہ اذان دیتے اور جب بلال اور ابو محذورہ دونوں نہ ہوتے تو عمرو بن اُم کلثوم اذان دیتے۔ بلال وقتِ اذان کی تاک میں لگے رہتے تھے اس لئے کبھی دیر نہ کرتے جب اذان سے فارغ ہو جاتے تو حضور کے دروازے پر آکر بیٹھ جاتے اور پکارتے:

حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح۔ الصلوٰۃ یا رسول اللہ۔

نماز کی طرف آئیے۔ فلاح کی طرف آئیے۔ یا رسول اللہ! نماز ـــ

اس کے بعد وہ الگ کھڑے ہو کر انتظار کرتے۔ جب حضور باہر آتے اور بلال دیکھتے تو اقامت شروع کر دیتے اور جب حضور عیدین یا نماز استسقا کے لئے نکلتے تو بلال حضور کے آگے آگے ایک چھوٹا سا نیزہ لئے ہوئے چلتے اور جب نماز کی جگہ پر حضورؐ آجاتے تو بلال اس نیزے کو آگے زمین میں

گاڑ دیتے اور اس کی طرف رُخ کر کے حضور نماز ادا فرماتے۔

حضور بلال سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کی عزت فرماتے تھے اور حضور خواہش کرتے کہ اور لوگ بھی بلال کی عزت کریں۔ حضور کے پاس ایک بار ایک عربی خاندان آیا اور عرض کیا کہ اس کی لڑکی کو کسی فلاں عربی شخص سے بیاہ دیا جائے۔ حضور نے ان سے فرمایا:

"تم کو بلال کا خیال کیوں نہیں آیا؟"

عرض داشت پیش کرنے والے لوگ کچھ بولے بغیر واپس چلے گئے۔ اور دوسرے دن وہی درخواست پیش کی جو ایک دن پہلے پیش کی تھی۔ حضور نے پھر وہی الفاظ فرمائے جو کل فرمائے تھے کہ:

"تمہیں بلال کا خیال کیوں نہ آیا؟"

اس دن بھی یہ لوگ خاموشی سے واپس چلے گئے اور تیسرے دن پھر وہی درخواست پیش کی اور حضور نے وہی کچھ فرمایا جو پہلی اور دوسری بار فرمایا تھا بلکہ کچھ اور بھی۔ حضور نے فرمایا:

"تمہیں بلال کا خیال کیوں نہیں آیا؟ ایک جنتی کی طرف تمہارا خیال کیوں نہیں گیا؟"

اس فرمان کے بعد بلال کی شادی ہو گئی۔ لوگ سمجھ گئے کہ رسولِ خدا لوگوں کے درمیان بجز تقوے اور نیک عمل کے اور کسی چیز کو بھی وجہ امتیاز قرار نہیں دیتے۔ اس کے بعد دوسرے لوگ اسی طرح بلال کا احترام کرنے لگے جس طرح رسولِ خدا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عمر بن خطاب کہا کرتے تھے کہ:

"ابوبکر ہمارے آقا ہیں اور انہوں نے ہمارے آقا کو (یعنی بلال کو)

آزاد کیا ہے۔

ان تمام باتوں کی وجہ سے بلال کو اپنے آپ سے خوش ہونا اور اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگنا چاہیئے تھا۔ مگر اُنہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہیچ ہی تصوّر کیا بلکہ ہمیشہ سچے دل سے وہ متواضع اور منکسر رہے۔ ایک بار اذان دینے کا اُنہوں نے ارادہ کیا تو دل میں کچھ عُجب و غرور سا پیدا ہُوا۔ اس وقت انہیں اپنے اوپر بڑا غصّہ آیا اور کچھ اپنے بارے میں کہنے لگے:

ایک شعر کہنا چاہتے مگر شعر تو نہ ہو سکا ہاں وزن درست تھا مگر قافیہ غلط تھا۔ اُنہوں نے کہا:

مالبلال ثکلته امه وابتل من نضح دم جبینه

بلال کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کی ماں اس پر روئے اور اس کی پیشانی خون سے تر ہو۔

بہت سے مسلمان بلالؓ کے پاس آکر گفتگو کرتے اور اللہ نے ان پر جو اپنا خاص فضل و کرم فرمایا تھا اس کا ذکر کرتے تو بلال اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے کہ:

"میں ایک حبشی ہوں اور کل تک غلام تھا۔"

فتح مکہ کے دن مسلمان مکّے میں فاتحانہ داخل ہوئے اور قریش اسلام کی طرف چار و ناچار مائل ہونے لگے۔ اور حضور نے ان بدسلوکیوں سے درگزر فرما دیا اور ان سے یوسفؑ والی بات دُہرادی جو اُنہوں نے اپنے خطاکار بھائیوں سے یوں کہی تھی کہ:

لا تثریب علیکم الیوم۔ یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین۔

آج تمہاری کوئی دار گیر نہیں ہوگی۔ اللہ تمہاری پوشش فرمائے۔ اور

وہ ارحم الراحمین ہے۔

اس کے بعد حضور نے بتوں کے ٹکڑے اُڑا دیئے اور کعبے کو پاک کر کے اللہ کے لئے خالص کر دیا۔ اس کے بعد بلال سے فرمایا:

"کعبے کی چھت پر چڑھ جاؤ۔"

بلال اوپر چڑھ گئے اور کعبے کی چھت پر اذان کہی۔ حارث بن ہشام اور صفوان بن اُمیہ نیچے کھڑے تھے۔ حارث بن ہشام نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنے آپ سے کہا:

"اگر آج میرا بھائی عمر بن ہشام (ابوجہل) بلال کو اس طرح کعبے کی چھت پر کھڑا دیکھ لیتا تو اس کا کیا عالم ہوتا؟"

صفوان بن اُمیہ نے بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر کہا:

"اگر آج میرا باپ اُمیہ بن خلف اس غلام کو جسے وہ مدتوں سزائیں دیتا رہا اس کعبے کی چھت پر کھڑا دیکھ لیتا تو اس کا کیا حال ہوتا؟"

اگر ان دونوں آدمیوں کا بس چلتا تو ان میں سے ہر ایک اپنے دل ہی دل میں بات کر کے رہ جاتا۔ مگر وہ اپنی آنکھوں سے اس کعبے کو دیکھ رہے تھے کہ وہاں سے ہبل۔ لات۔ عزیٰ اور منات سب ہٹ گئے اور اس کعبے کی چھت پر چڑھ کر ایک حبشی دینِ محمدؐ کا اعلان ایک ایسی قوم کے سامنے کر رہا ہے جو محمدؐ اور ان کے اصحاب سے مدتوں جنگ کرتی رہی اور آج ان میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو پیغامِ محمدی پر چار و ناچار لبیک نہ کہے۔

یہ دونوں آدمی دیکھ رہے تھے کہ کعبہ بتوں سے پاک ہو گیا اور ایک حبشی اس کی چھت پر کھڑا ہے۔ ان دونوں کو اتنی جرأت بھی نہ ہو سکی کہ ایک

حسرت کے لہجے میں دوسرے کے کان میں چپکے سے کہتا کہ "اس حبشی کو دیکھتے ہو؟" اور دوسرا چپکے سے تلخ طنز سے کہتا کہ "مگر اللہ اسے ناپسند کریگا"۔ اور بلال ہیں کہ کعبے کی چھت پر کھڑے اپنی بلند آواز سے پکار رہے تھے کہ:

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں

یہی بلال مدینے میں مسلمانوں کو اپنی اذان سُنا رہے تھے اور مسلمان انکی اذان کا جواب غمگین دل سے دے رہے تھے۔ لیکن جب بلال نے اپنی حلق میں اٹکنے والی آواز سے اشھد ان محمداً رسول اللہ، کہا تو مسلمانوں کی جماعت نے اس زور کی چیخ ماری کہ مسجد ہل گئی۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضور کی روح پرواز کر کے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملی تھی اور جسدِ اطہر دفن نہیں کیا گیا تھا۔ تدفین کے بعد جب ابوبکر کی بیعت خلافت کر لی گئی تو بلال نے کھڑے ہو کر کہا:

"اے خلیفۂ رسول اللہ! اگر آپ نے مجھے اپنے لئے خریدا تھا تو مجھے روک دیجئے اور اگر آپ نے مجھے اللہ کے لئے خریدا تھا تو مجھے اور میرے عمل کو اللہ کے لئے سمجھئے"۔

"تم کیا چاہتے ہو بلال؟"

"میں نے حضور کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بندے کا سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس لئے مجھے جہاد پر بھیج دیجئے"۔

ابوبکر نے ان کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ باز نہ رہ سکے۔ بلال شام کی طرف چلے گئے اور سرحد پر جنگ کرتے رہے اور دمشق میں وفات پائی۔

(۲۰)

عمار بن یاسر جب ہجرت کر کے مدینے آئے تو مبشر بن عبد المنذر کے پاس ٹھہرے۔ حضور نے ان کی مواخات (بھائی چارہ) حذیفہ بن الیمان سے کرائی تھی۔ عمار اپنے میزبان (مبشر) کے پاس اس وقت تک رہے جب تک کہ حضور نے ان کے گھر کے لئے جگہ نہ دے دی اور وہ گھر بنا کر وہاں منتقل نہ ہو گئے۔ حضور کی عنایتیں عمار پر بہت تھیں۔ اور وہ حضور سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ عمار حضور کے لطف و کرم کا اور اپنی محبت کا پورا پورا احساس رکھتے تھے اس لئے اس احساس نے ان کے اندر بڑی اسلامی پختگی پیدا کر دی تھی۔ اس صفت میں بہت سے مسلمانوں سے ایسا امتیاز خاص رکھتے تھے کہ لوگوں کی نظریں ان کی طرف اُٹھ جاتی تھیں اور دل میں اس بات پر غور کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات لوگوں کی زبان پر بھی آ جاتی تھی۔ اللہ کی راہ میں محنت و مشقت جدو جہد اور جفاکشی عام مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ کیا کرتے تھے۔ حضور نے اپنی مسجد کی تعمیر شروع کی تو تمام مسلمانوں نے اس کی تعمیر میں شرکت کی۔ ان کی نگاہوں میں یہ اشتراکِ عمل ان کے لئے سراپا خیر و برکت اور سعادت تھا۔ خود حضور اس کی تعمیر کے وقت محنت و مشقت میں کسی سے کم حصہ نہ لے رہے تھے۔ ان کے ساتھ اینٹیں اُٹھاتے اور چہرہ مبارک خاصا غبار آلود ہو جاتا۔ ہر مسلمان ایک ایک اینٹ اُٹھا رہا تھا اور عمار دو دو اینٹیں اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اور اس میں انہیں ایسی دل چسپی اور خوشی ہو رہی تھی کہ انہیں دیکھ کر مسلمانوں کے دل میں خوشی اور منافقین کے دل میں

حسد پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی اینٹیں اُٹھاتے تو یہ رجز پڑھتے:

نحن المسلمون نبنی المساجد۔

ہم مسلمان خانۂ خدا تعمیر کر رہے ہیں۔

حضورؐ اس رجز کے جواب میں "المساجد" کے لفظوں کو ان کے ساتھ دُھراتے۔ اور اکثر عمار کو دیکھ کر حضورؐ کو ترس آجاتا اور حضورؐ ان کے پاس آکر بڑی محبت اور نرمی کا انداز اختیار کرتے اور ان کے چہرے اور سینے سے مٹی صاف کرتے۔ ایک دن ان کے چہرے سے مٹی جھاڑتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا:

ویحک بن سمیہ تقتلک الفئۃ الباغیۃ

ہائے اے سمیہ کے فرزند تجھے ایک باغی گروہ قتل کر دے گا۔

حضورؐ کی یہ گفتگو مسلمانوں کے دل میں نقش ہو کر رہ گئی۔ اور عمار کی ایک خاص وقعت اور رعب پیدا ہو گیا۔ یہ بات حضورؐ نے عمار سے ایک ہی بار نہیں کہی بلکہ جیسا ظاہر ہوتا ہے کئی موقعوں پر فرمایا۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے وقت یہ الفاظ کہے اور یہی الفاظ چند سال کے بعد خندق کھودتے وقت بھی فرمائے۔ خندق کھودتے وقت بھی عمار کی محنت اسی طرح دوگنی تھی، جس طرح مسجد نبوی بناتے وقت تھی۔ اور حضورؐ بھی اپنے اصحاب کے ساتھ ایک معمولی انسان کی طرح کام کر رہے تھے۔ خندق کھودتے۔ مٹی اور پتھر اُٹھا کر پھینکتے۔ حضورؐ رجز خوانی بھی کرتے جاتے اور لوگ بھی اس کے جواب میں یہی رجز دُھراتے۔ کہ:

لاھم ان العیش عیش الاخرہ   فاغفر للانصار والمھاجرہ

اے اللہ زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے لہذا اپنے انصار اور مہاجرین

کی مغفرت فرما۔

ایک آنے والا آیا اور اس کا خیال تھا کہ دیوار عمار پر گر پڑی جس سے ان کا انتقال ہو گیا۔ مگر حضور نے فرمایا کہ "عمار مرا نہیں" اس کے بعد حضور عمار سے ملے اور فرمایا:

"ہے ہے فرزند سمیہ! تجھے تو ایک باغی جماعت قتل کرے گی"

اس جملے سے عمار کا دل یقین اور اعتماد سے بھر گیا اور ان کے اندر زیادہ سے زیادہ نیک عمل کر لینے کی طرف لپک پیدا ہو گئی۔ اور فتنے سے اجتناب کا جذبہ بھی تیز ہو گیا۔ وہ زیادہ تر خاموش رہنے لگے وہ بلا ضرورت کوئی گفتگو نہ کرتے۔ اپنی مسلسل خاموشی کے بعد عموماً یہ جملہ بولا کرتے:

"فتنے سے اللہ کی پناہ۔ فتنے سے اللہ کی پناہ"

یہ کہہ کر پھر اپنی عمیق خاموشی میں ڈوب جاتے۔

ایک دن خالد بن ولید اسلام لانے کے بعد آئے۔ ان کے اور عمار کے درمیان چشمک تھی۔ خالد نے عمار کے بارے میں کچھ سخت لفظ کہا۔

گویا انہوں نے یاسر کے متعلق یوں ذکر کیا کہ وہ ان کے چچا ابو حذیفہ کے حلیف تھے اور عمار کو ان الفاظ سے یاد کیا کہ وہ ان کے چچا ابو حذیفہ کے آزاد کردہ ہیں۔ خالد میں مخزومی نخوت کی بو اور قریش کی لاف زنی کی رمق ابھی باقی تھی۔ عمار حضورؐ کے پاس خالد کی شکایت لے کر آئے۔ اس اثناء میں خالد بھی آ گئے اور عمار کے متعلق کچھ کہنے لگے جسے خاموشی سے عمار سنتے رہے اور حضور سر جھکائے رہے۔ اس کے بعد حضور

نے سر اُٹھا کر ایسے اطمینان اور شیریں انداز سے جو دلوں میں اُتر جائے یوں فرمایا:

من عادی عمارًا فقد عادانی

جو عمار سے دشمنی رکھتا ہے وہ مجھ سے دشمنی رکھتا ہے

عمار انتہائی خوشنودی کے ساتھ اور خالد حد درجے کڑھن اور غم کے ساتھ باہر نکلے۔ پھر خالد اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک عمار کو خوش کر کے انہیں یقین نہ ہو گیا کہ انہوں نے جو گزند پہلے انہیں پہنچائی اسے عمار نے معاف کر دیا۔

---

(۲۱)

وفات نبوی کے بعد عرب میں ارتداد پھیل گیا۔ ابوبکر اور مہاجرین و انصار نے پوری کوشش کی کہ وہ اسلام کی طرف چار و ناچار واپس آجائیں۔ خالد بن ولید جیش ابوبکر کو لے کر یمامہ کی طرف گئے۔ تاکہ مسیلمہ سے قتال کر کے بنی حنیفہ کو اسلام پر واپس لائیں۔ مسلمانوں اور مرتدوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور وہاں ایسا معرکہ ہوا کہ مسلمانوں نے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ جیش ابوبکر میں چار شخص ایسے تھے جو بدر۔ اُحد اور تمام غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک تھے۔ عمار بن یاسر۔ ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ اور ان کا قدیم غلام اور جدید فرزند سالم بن سالم اور ان کے سالے عبداللہ بن سہیل بن عمرو۔

مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے اور قریب تھا کہ ان پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے مگر لوگوں نے ان چار آدمیوں کو دیکھا کہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں اور ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ سالم للکار رہے تھے۔

"ہم اس طرح حضور کی معیت میں نہیں لڑا کرتے تھے۔"

اس کے بعد اُنہوں نے گڑھا کھودا۔ اس میں اپنے پاؤں جما دیئے۔ ابوحذیفہ اور عبداللہ بن سہیل نے بھی یہی عمل کیا اور یہ تینوں وہیں اپنی جگہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

عمار کو لوگوں نے دیکھا کہ ایک چٹان پر کھڑے ہیں اور ان کا کان کٹ کر لٹک رہا ہے اور وہ مسلمانوں کو پکار رہے ہیں کہ:

"مسلمانوں میری طرف آؤ۔ میں ہوں عمار بن یاسر۔ کیا تم جنّت سے بھاگ رہے ہو؟"

عمار اسی طرح مسلسل مسلمانوں کو للکارتے اور پکارتے رہے اور اپنی جگہ پتھر پر جمے رہے تا آنکہ مسلمان پھر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اور اللہ نے اپنی مدد نازل فرمائی۔ ابوبکر کو خبر پہنچی کہ سالم شہید ہو گئے۔ تو ان کی میراث ان کی مولاۃ (آزاد کرنے والی) ثُبَیتہ کے پاس بھجوادی۔ ثُبَیتہ نے یہ کہہ کر واپس کر دی

"میں نے اسے اللہ کے لئے آزاد کیا تھا۔"

عمر نے خلیفہ ہونے کے بعد ایک بار اور سالم کی میراث ثُبَیتہ کے پاس بھیجی جو سالم کی ولایت کا حق رکھتی تھیں۔ مگر ثُبَیتہ نے پھر یہی کہہ کر واپس کر دی

"میں نے اللہ کے لئے آزاد کر دیا تھا۔"

اس کے بعد عمر نے اسے بیت المال میں داخل کر دیا۔

ابوبکر اپنی خلافت کے دوران میں حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جب مکّے پہنچے تو سہیل بن عمرو سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ ابوبکر نے ان کے فرزند عبداللہ کی تعزیت فرمائی جو جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے تھے۔ سہیل بولے مجھے حضور کا یہ ارشاد معلوم ہوا کہ:

"شہید اپنے خاندان کے ستر آدمیوں کی سفارش کرے گا۔"

اور مجھے یقین ہے کہ میرا فرزند سب سے پہلے میری ہی سفارش کریگا۔

---

(۲۲)

عمر نے اپنے پیشروؤں کے بعد مسلمانوں کے معاملات کو اسی طرح سنبھالے رکھا اور سیاسی فتوحات کا جو آغاز دونوں پیشروؤں نے کیا تھا اسے برابر جاری رکھا۔ نہ خود کوئی کمزوری دکھائی نہ کسی اور کو کمزوری دکھانے کا موقع دیا۔ بلکہ قدیم متمدن ممالک پر حملہ کیا اور عربوں کو ان پر غالب کر دیا۔ وہ عربوں کے مقابلے میں بس اتنی دیر ٹھہر سکے کہ مقابلے میں آئے اور پسپا ہو گئے۔ عمر نہ خود سوتے تھے نہ سونے دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ بیدار رہتے اور بیدار رکھتے۔ مصروفِ عمل رہتے اور مصروفِ عمل رکھتے۔ عمر نے سب سے آخر میں اسلام لانے والے عربوں کے لئے عموماً اور قریشیوں کے لئے خصوصاً جہاد کے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں یہ بات اتار دی تھی کہ جو شخص حضور کے ساتھ بدر۔ احد۔ خندق وغیرہ کے جہاد میں شرکت کا ثواب نہ حاصل کر سکا ہو تو اس کے سامنے روم اور فارس کی سلطنتیں موجود ہیں۔ جو شخص پہلے کوئی آزمائش نہ جھیل سکا ہو وہ ان سلطنتوں کے مقابلے میں جا کر تلافی کرے۔ اس سے بہتر امتحان اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی جو سن رسیدہ ہو چکا ہے اور وہ شخص بھی جو اپنے شباب سے ابھی باہر نہ ہوا ہو اور وہ جوان بھی جس کا لباسِ طفلی نہ اترا ہو، سب کے سب اس وعدۂ الٰہی کی تحقیق و تصدیق کا ذریعہ اور وسیلہ بن جائیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

وعد اللہ الذین منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض

کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جس طرح اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور ان کے اس دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے متمکن کر دے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ کہ وہ میری بندگی کریں گے میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گے۔

جب عمر نے ان عربوں کو ابھارا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور راستے میں جو مشکل بھی آئی اس پر قابو پا لیا جو گھاٹی بھی ملی اسے عبور کر لیا اور جو رکاوٹ بھی پیش آئی اس کے پرخچے اُڑا دئے۔

اصحاب رسول اللہ اور وہ لوگ جو حضور کے ساتھ غزوات میں خاص طور پر شریک رہے تھے وہ بھی اس جہاد کی طرف لپکنے میں ان لوگوں سے کسی طرح کم نہ تھے جو اخیر میں اسلام لائے تھے۔ عمر ان لوگوں کو اس سے روکتے بھی نہ تھے۔ اس ثواب کا حصول جو چاہتا اور جہاں چاہتا اس کے لئے عمر نے راستہ کھلا رکھا تھا۔ البتہ اکابر قریش کو مدینے ہی میں روک رکھا تھا اور ان کو باہر جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ قبیلہ قریش کے عوام سے ان کو ڈر لگا رہتا تھا۔ اور ان کے خواص کی طرف سے بھی فتنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ قریش کے اکابر صحابہ میں سے اگر کوئی جہاد کے لئے باہر جانا چاہتا تو اسے روک دیتے تھے اور کہتے کہ:

"تم حضور کے ساتھ تو اتنا جہاد کر ہی چکے ہو یہ تمہارے لئے کافی ہے"
رہے قریش اور غیر قریش کے زبردست صحابہ تو عمر کو ان سے کسی فتنے کا اندیشہ نہ تھا۔ لہٰذا ان کے لئے جہاد اور غنیمت کا راستہ کھلا رکھا تھا۔ اسی وجہ سے بلال۔ ابوذر اور ابنِ مسعود شام کی طرف گئے اور کچھ دوسرے لوگ عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینے میں وہی لوگ رہے جن کو جسمانی کمزوری نے روک رکھا تھا۔ یا عمر کی سیاست نے۔ ایک دن خباب بن ارت عمر کے پاس آئے۔ وہ غالباً اس لئے آئے تھے کہ کسی جیش کے ساتھ عراق جانے کی اجازت مانگیں۔ عمر ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور ان کو قریب بلا کر اپنی گدّی پر بٹھایا اور کہا کہ:

"اس جگہ کا حق دار آج دُنیا میں تُم سے زیادہ کوئی نہیں۔ ایک آدمی کے سوا۔"

"وہ کون ہے یا امیر المومنین؟"

"بلال"

ایک اور روایت میں ہے کہ بلال کی بجائے اُنہوں نے عمار بن یاسر کا نام لیا تھا۔ اس پر خباب بولے:

"وہ مجھ سے زیادہ حق دار نہیں کیونکہ بعض قریش ان کی حمایت کرنے والے اور انہیں بچانے والے موجود تھے۔ لیکن میرا کوئی نہ تھا۔ ایک دن قریش نے مجھے پکڑا اور آگ سلگائی اور مجھے ڈھکیل دیا۔ پھر ایک آدمی آیا اور اس نے میرے سینے پر پاؤں رکھ دیا کہ میں نہ اُٹھ سکوں۔ اس کے بعد پیٹھ زمین کی ٹھنڈک سے آج تک محروم ہے۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنی چادر اُٹھائی تاکہ پشت پر اس سزا کے جو

نشان باقی تھے وہ عمرؓ بھی دیکھ لیں۔ چنانچہ عمرؓ نے دیکھا اور دوسرے مسلمانوں نے بھی۔ یہ بڑا دردناک منظر تھا۔ خباب کی پیٹھ سفید ہو رہی تھی۔

یہ تکلیفیں اور جراحتیں ان کو حضورؐ کے ساتھ کسی غزوے میں جانے سے نہ روک سکیں خواہ وہ بدر ہو یا اُحد۔ خندق ہو یا دوسرے غزوات۔ انہوں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کے بعد بھی مسلسل جہاد پر اصرار رہا۔ گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ جتنی محنت و مشقت انہیں جھیلنی چاہیئے وہ ابھی تک نہیں جھیلی۔ وہ عراق بھی گئے اور غازیوں، مجاہدوں کے ساتھ غزوۂ و جہاد میں مصروف رہے پھر کوفے میں رہنے لگے جہاں ان پر بڑھاپا آگیا اور بیماری شدید ہو گئی۔ چند صحابۂ رسولؐ ان کی عیادت کے لئے آئے۔ شکم پر سات جگہ علاج کے لئے داغا جا چکا تھا اور بیماری کی تکلیف اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ یہ لوگ جب ان کے پاس گئے تو دیکھا خباب گھبرائے ہوئے ہیں بلکہ خوف کے ساتھ غم بھی ان کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ اپنے ان عیادت کرنے والوں سے کہنے لگے:

"اگر حضورؐ نے موت کی تمنّا کرنے سے روکا نہ ہوتا تو میں موت کی تمنّا ضرور کرتا۔"

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ جسم بے حس و حرکت تھا آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر کر چہرے پر بہنے لگے۔ ان کی مزاج پرسی کرنے والے صحابہ نے انہیں تسکین دیتے ہوئے کہا:

"ابو عبداللہ! تمہارے فلاں فلاں بھائی ہیں جن سے تم کل جا ملو گے۔"

یہ سُن کر وہ زار و قطار رونے لگے۔ اور کچھ بات کرنے کی سکت نہ رہی۔ ذرا دیر بعد جب انھیں کچھ سکون ہُوا تو اپنی کمزور اور رُکتی ہوئی آواز

میں کہا:

"مجھے مرنے کا کوئی غم نہیں۔ مگر تم نے چند ایسے گزرے ہوئے لوگوں کا نام لیا ہے جن کو تم میرا بھائی بتاتے ہو۔ وہ لوگ اپنا اجر لے کر رخصت ہو گئے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ جو کچھ ہمیں ان کے بعد (مال واسباب) ملا ہے کہیں وہی ہمارے اعمال کا ثواب بن کر نہ رہ جائے۔"

اس کے بعد ان پر غشی طاری ہو گئی اور زبان بند ہو گئی۔ لوگ سمجھے کہ شاید قضا کر گئے یا کرنے والے ہیں۔ لیکن ذرا دیر بعد ہی ان میں کچھ جان سی آگئی انہوں نے دیکھا کہ ان کے لئے کفن لا کر رکھا جا چکا ہے۔ جو قباطی (کپڑے کی ایک قسم) کا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت روئے اور کہا:

"حضور کے چچا حمزہ کو جس کپڑے کا کفن دیا گیا تھا وہ اتنا چھوٹا تھا کہ جب سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپا جاتا تو سر کھل جاتا۔ آخر پاؤں پر اذخر (ایک خوشبودار گھاس) ڈال دی گئی میں جب حضور کے ساتھ تھا تو میں ایک دینار یا ایک درہم کا بھی مالک نہ تھا۔ لیکن اس وقت میرے گھر کے گوشے والے صندوق میں چالیس ہزار روافی، (درہم سے بڑا سکہ) موجود ہیں۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری جزا اس حیات دنیا میں جلد چکا دی گئی ہو۔"

صحابہ جب وہاں سے واپس ہوئے تو راستے میں ان کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ایک نے کہا:

"خباب کو دیکھتے ہو انہوں نے کتنی مصیبتیں اٹھائیں اور کتنے عمل کئے۔ مگر انہیں ڈر یہ ہے کہ کہیں اللہ کے سامنے عمل صالح کے لحاظ سے تہی دست ہو کر نہ حاضر ہوں۔"

"اس میں اتنی حیرت کیوں ہے؟ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ عثمان بن مظعون کے متعلق ایک عورت نے کہا تھا کہ "مرنے کے بعد اللہ نے ان پر فضل و کرم کیا کہ نہیں؟" اس پر حضور نے فرمایا: "میں اللہ کا رسول ہوں مگر مجھے بھی یہ نہیں معلوم کہ خود میرے ساتھ کیا ہو گا۔"

یہ تکلیف دہ مرض، یہ جانکاہ دکھ اور یہ خوفِ خدا خباب کو اس حالت میں بھی مسلمانوں کی خیر خواہی اور تعلیم سے بھی باز نہ رکھ سکا حالانکہ وہ دنیا کا آخری اور آخرت کی طرف پہلا قدم اُٹھا چکے تھے۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ لوگ اپنے مُردوں کو اپنے گھر کے یا محلّے کے قریب ہی کے قبرستان میں دفن کرتے تھے۔ مگر خباب نے اپنے فرزند سے مرتے وقت کہا کہ:

"مر جاؤں تو مجھے آبادی سے باہر فلاں جگہ دفن کرنا۔ لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے کہ رسول اللہ کا ایک صحابی کوفے سے باہر دفن ہوا ہے۔ پھر وہ بھی اپنے مُردوں کو آبادی کے باہر ہی دفن کرنے لگیں گے۔"

اس آخری تعلیم کے بعد خباب چل بسے۔ علی نے نماز جنازہ پڑھائی نماز کے بعد وہ شہر سے باہر دفن کیے گئے۔ پھر لوگ بھی اپنے مُردوں کو وہیں ان کی قبر کے آس پاس دفن کرنے لگے۔

---

(۲۳)

صہیب رومی کا جود و سخا میں جو انداز اسلام لانے سے پہلے تھا وہی اسلام لانے کے بعد بھی جاری رہا۔ اسلامی فتوحات کے بعد ان کے پاس دولت کافی ہو گئی تھی اور اسی تناسب سے ان کی داد و دہش میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگوں میں اس کا بڑا چرچا رہا۔ ہر شب وہ بہت سے لوگوں کو جمع کرتے اور خوب کھلاتے۔ اور لوگوں کی زبان پر ابو یحییٰ کی سخاوت، ابو یحییٰ کی نیکی وغیرہ کا بار بار ذکر آنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے سنا تو لوگوں سے پوچھا:

"یہ ابو یحییٰ کون ہے۔ جس کا لوگ ذکر کرتے ہیں؟"

"صہیب"

"کیا ان کا کوئی فرزند ہے جس کی وجہ سے ان کی کنیت ابو یحییٰ ہے؟"

"وہ اپنی کنیت ابو یحییٰ ہی بتلاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو خوب کھلاتے پلاتے ہیں جیسا کہ ان کی عرب قوم کے سخی لوگوں کا معمول تھا۔"

"صہیب عربی النسل ہیں؟

"ہم سے تو وہ یہی بیان کرتے ہیں۔"

عمرؓ خاموش ہو گئے اور کچھ نہ بولے۔ ایک دن مسجد نبوی میں بہت سے لوگ عمرؓ کے گرد جمع تھے اور صہیب بھی وہیں تھے۔ انھوں نے صہیب کو بلا کر پوچھا:

"تمہارا کوئی لڑکا تو ہے نہیں، پھر یہ ابو یحییٰ تمہاری کنیت کیسے ہو گئی؟

پھر تم روم کے رہنے والے ہو، اپنے آپ کو عربی کیسے کہتے ہو۔ اور لوگوں کو خوب کھلاتے پلاتے ہو، یہ تو اسراف ہے۔"

"حضورؐ اکرم نے خود مجھے ابو یحییٰ کی کنیت عطا فرمائی ہے۔ رہا میرے نسب کا معاملہ، تو وہ یوں ہے کہ میں موصل کے قبیلہ نمر بن قاسط کا فرد ہوں۔ مجھے رومیوں نے اس وقت گرفتار کر کے غلام بنا لیا تھا جب میں چھوٹا بچہ تھا، مگر اپنے خاندان، قوم اور نسب کو سمجھنے کی عقل رکھتا تھا۔ اور کھلانے یا اسراف کرنے کے متعلق آپ نے جو فرمایا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ اکرم نے فرمایا ہے کہ "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو کھلائے پلائے اور سلام کا جواب دے"۔ بس یہی چیز ہے جو مجھے کھلانے پلانے کی ترغیب دیتی ہے۔"

اس کے بعد عمرؓ خاموش ہو گئے۔

صہیب جب تک زندہ رہے مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ بنے رہے جس کا نقشہ حضورؐ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

المسلم من سلم الناس من لسانہ ویدہ۔

"مسلم تو وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں۔"

صہیب سب کے ساتھ اپنی طرف سے بھلائی ہی کرتے تھے اور اپنے مال اور اپنے علم دونوں میں سخاوت اور فیاضی کا برتاؤ کرتے تھے۔ مال دینے میں زیادہ احتیاط اور کفایت شعاری نہ برتتے اور علمی سخاوت میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ البتہ صرف ایک موقعے پر علمی سخاوت میں وہ بڑی احتیاط برتتے تھے۔ یہاں آکر ان کا طرزِ عمل وہی ہو جاتا تھا جو خیارِ صحابہ کا تھا یعنی حدیثِ نبوی بیان کرنے کو پسند نہ کرتے تھے۔ انہیں اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں اس میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ وہ لوگوں سے کہتے کہ:

"آؤ میں تمہیں غزوات کا حال سناؤں مگر یہ نہیں کہوں گا کہ "حضورؐ نے یوں فرمایا۔"

ابوبکر و عمر کی زندگی میں صہیب کی پوزیشن وہی تھی جو ایک سخی داتا مہاجر کی ہوتی ہے لیکن جب عمر پر قاتلانہ حملہ ہوا اور انہوں نے محسوس کیا کہ اب رحلت قریب ہے تو شوریٰ کا انتظام کیا اور جہاں دوسرے احکام دیئے وہاں ایک حکم یہ بھی دیا کہ تین دن تک صہیب نماز کی امامت کریں تاآنکہ اہل شوریٰ اپنا ایک امام منتخب کرلیں۔

مہاجرین و انصار دیکھ رہے تھے کہ عمر کے حکم سے صہیب امامت کر رہے ہیں اس لیے جب عمر کا جنازہ آیا تو لوگوں نے صہیب ہی کو آگے بڑھایا اور ان ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اس وقت تک صہیب ہی مسلمانوں کے امام رہے تاآنکہ اہل شوریٰ اپنے مشوروں سے فارغ ہوگئے۔ صہیب کی اس امامت پر مہاجرینؓ انصار میں سے تو کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔ لیکن چند قریشی نوجوانوں نے اس کے متعلق کچھ چہ میگوئیاں ضرور کیں۔ عمر چونکہ قریش کے معاملے میں بھی بہت سخت تھے۔ اور بالعموم حق پر قائم رہنے میں بھی سخت تھے۔ اس لئے نوجوانانِ قریش کو عمر سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اور وہ ان کے طرزِ عمل سے مطمئن نہ تھے۔ ان نوجوانوں میں یوں گفتگو ہونے لگی :

ایک : عمر کو دیکھتے ہو؟ اس رومی کو آگے بڑھا رہے ہیں کہ مہاجرین و انصار کی امامت کریں حالانکہ یہ ایک قریشی کے غلام تھے۔"

دوسرا : غنیمت ہے کہ انہوں نے صرف اتنا ہی کیا کہ صہیب کو نماز کا امام بنادیا اور امارت کا معاملہ دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ خود اپنے میں سے

کسی کو امیر منتخب کر لیں۔ ورنہ ان سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ خلافت ہی صہیب کے سپرد کر جاتے۔"

تیسرا: اتنی بدگمانی تو نہ کرو۔ بعض گمان گناہ بھی ہوتے ہیں۔ عمر ایسے تو نہ تھے کہ عبداللہ بن جدعان کے ایک رومی یا عربی غلام کو مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کر جاتے۔"

دوسرا: (ایک طنز آمیز ہنسی کے ساتھ) کیوں کیا تمہیں عمر کا یہ قول یاد نہیں کہ "اگر ابو عبیدہ بن الجراح زندہ ہوتے تو میں ان ہی کو خلیفہ مقرر کر دیتا۔ اگر سالم (ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام) زندہ ہوتے تو میں انہی کو خلیفہ مقرر کر دیتا۔"

سالم بہر حال ابو حذیفہ کے فارسی غلام ہی تو تھے جو اصطخر کے رہنے والے تھے۔ جب عمر کی یہ آرزو تھی کہ ایک فارسی غلام کو خلیفہ بنا جائیں تو ایک رومی غلام کو خلیفہ بنانے سے انہیں کیا چیز روک سکتی تھی۔

چوتھا: (بہت ناراض ہو کر) خدا رحم کرے۔ میں نے آج تک کسی کو اس طرح پچھلی جاہلیت کی طرف لوٹتے نہیں دیکھا۔ تم لوگ اپنے اسلام میں سچے بھی ہو یا منافق ہو۔ عمر پر خدا کی رحمت ہو۔ وہ سراپا نیکی تھے۔ اللہ، رسول اور مسلمانوں کے سچے بہی خواہ تھے۔ کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی:

یاایہا الناس انا خلقنا کم من ذکر وانثیٰ وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، ان اللہ علیم خبیر۔

اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک زن و مرد سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور گوت اس لیے بنائے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، ورنہ تم میں جو سب سے زیادہ متقی ہے وہی اللہ کے نزدیک تم سب سے زیادہ معزز و مکرم ہے۔ اللہ علیم و خبیر ہے۔

اس کے بعد یہ نوجوان منتشر ہو گئے۔ ان میں بعض حق و ہدایت کی طرف مائل تھے اور بعض اپنے دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ حکومت صرف عربوں کا حق ہے اور کسی کے لئے — خواہ عمر ہی کیوں نہ ہوں — یہ درست نہیں وہ حکومت کو عربوں اور خصوصاً قریشیوں سے ہٹا کر فارسیوں اور رومیوں میں منتقل کر دے۔ ان نوجوانوں کے اور ان جیسے دوسرے بہت سے لوگوں کے یہی وہ خیالات تھے جو مسلمانوں کے لئے ہولناک تباہیوں کی جڑ ہے۔

(۲۴)

حمص کے فتح ہونے کے بعد عبداللہ بن مسعود حمص ہی میں مقیم ہو گئے۔ وہاں وہ راہِ خدا میں سرحد کی حفاظت کرتے رہے۔ ایک دن مدینے کے مہاجرین و انصار نے دیکھا کہ وہ مسجد میں سامنے ہی موجود ہیں تو لوگ سلام کرتے ہوئے ان کی طرف لپکے اور مدینے آنے کی وجہ دریافت کی۔ ابنِ مسعود نے جواب دیا:

"مجھے خود نہیں معلوم۔ امیرالمومنین نے بلایا تو میں چلا آیا۔"

اس کے بعد عمر عبداللہ بن مسعود سے ملے اور تنہائی میں باتیں کیں۔ ان کے بعد عمار بن یاسر کو اندر بلایا اور ان دونوں کے بعد عثمان بن حنیف کو بلایا پھر نماز کے بعد مسلمانوں کو بتایا کہ:

"کوفے کی امامتِ نماز اور محکمۂ جنگ عمار بن یاسر کے سپرد کیا گیا۔ بیت المال کا انتظام اور محکمۂ تعلیم عبداللہ بن مسعود کے حوالے ہوا اور سوادِ[1] کوفہ کا انتظام عثمان بن حنیف کو دیا گیا۔"

مہاجرین و انصار میں جو سابقین اوّلین تھے وہ تو ان تینوں کی نیک نیتی اور حسین سیرت سے واقف تھے اس لئے عمر کے اس اعلان کو سُن کر مسرور ہوئے۔ لیکن جو اکابرِ قریش اخیر میں اسلام لائے تھے اُنہوں نے یہ اعلان بہ ظاہر تو تسلیم و رضا کے ساتھ سنا مگر ان کے دلوں میں کچھ ناراضی

---

[1] سواد عام آبادی کو بھی کہتے ہیں اور نواحی شہر کو بھی۔ جس میں دیہات اور زرخیز علاقے سب داخل ہیں۔

سی رہی۔ ایک نے کہا:

"خدا عمر کو بخشے، اُنہوں نے قریش کے ساتھ کیا کیا؟ ذرا دیکھو تو سہی کہ کوفے کی امارت سمیہؓ کے فرزند کے سپرد کر دی، اور بیت المال اور محکمۂ تعلیم ام عبد کے فرزند کے حوالے کر دیا۔ قریش کے اکابر اور مہاجرین سابقین ان کی نظروں سے کیوں اوجھل ہیں؟"

اس کے ساتھی نے جواب دیا:

"بھئی ذرا اپنی زبان کو روکے رہو، کہیں عمر کو تمہاری یہ باتیں نہ معلوم ہو جائیں۔ وہ تم پر نفاق کا گمان کرینگے اور ایسی مرمت کرینگے کہ تمہیں ہرگز پسند نہ آئے گی۔ تم بہت اخیر میں اسلام لائے ہو اور میرا خیال ہے کہ تم نے قرآن بھی کم ہی پڑھا ہے۔ کیا تم نے یہ آیت نہیں سنی کہ:

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم الوارثین ونمکن لهم فی الارض ونری فرعون وهامان وجنودهما منهم ما کانوا یحذرون۔

ہم چاہتے تھے کہ زمین کے زیر دستوں پر احسان کریں، انہیں وارث بنائیں اور انہیں زمین میں تمکن عطا کریں اور فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو وہ نتیجہ دکھا دیں جس سے وہ بڑے ہوشیار رہتے تھے۔

پس عمر نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا کہ اللہ کے بعض وعدے کو ان چند زیر دستوں کے ذریعے پورا کر دیا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود اور عثمان بن حنیف کوفے روانہ ہو گئے۔ لوگ وہاں مسجد میں اکٹھا ہوئے اور عمر کا یہ فرمان پڑھ کر سنایا گیا:

اما بعد۔ میں نے تمہاری طرف عمار بن یاسر کو امیر بنا کر اور عبداللہ بن مسعود کو معلّم و وزیر بنا کر بھیجا ہے اور ابنِ مسعود کو تمہارے بیت المال کا بھی منتظم بنایا ہے۔ یہ دونوں بدری صحابی ہیں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کی بات سنو، اطاعت کرو اور ان کی اقتدا کرو۔ میں نے ابن ام عبد کے بارے میں تم کو اپنے اوپر ترجیح دی ہے اور عثمان بن حنیف کو سواد کوفہ پر مقرر کیا ہے۔ اور ان تینوں کے آذوقے کے لئے ہر روز ایک "بکری" مقرر کی ہے۔ اس کے دو حصّے ہوں گے۔ ایک حصّہ عمار کو اور ایک حصّہ ان دونوں میں تقسیم ہوگا۔

اہلِ کوفہ نے یہ فرمان بڑی مسرّت سے سنا، مانا اور اچھی طرح مانا او[ر] ان کے ان امیروں نے بھی خوش اسلوبی سے سیاستِ ملکی انجام دی۔ عمار دی[کھ] رہے تھے کہ اب وہ مسلمانوں کے ایک بڑے شہر اور بڑے لشکر کے امیر ہیں غالباً ان کے ذہن میں وہ مصائب و آلام بھی موجود تھے جو انہوں نے ہجرت مدینہ سے پہلے برداشت کئے تھے اور وہ سختی اور جنگ بھی جو حضور [کے] ساتھ بعد از ہجرت دیکھی۔ پھر بھی ان باتوں نے ان کے دل میں اپنے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہونے دی ان کا تو صرف اس پر ایمان تھا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے۔ ان باتوں نے ان کے اندر کوئی تکبر، جباریت اور کوئی بڑائی نہیں پیدا کی۔ ان کو اپنی سطح کے دوسرے صحابہ کی طرح یقین تھا کہ یہ حیاتِ د[نیا] ایک فریب ہے، امتحان گاہ ہے جہاں اچھے لوگوں کی آزمائش ہوتی [ہے] جو اس سے شرافت، پاکیزگی اور سلامت قلبی کے ساتھ نکل جائے وہ نجات [پاتا] ہے اور جو اپنی خواہشوں کی تکمیل اور خوشنودئ نفس کے لئے حصول لطف و لذّ[ت] میں پڑ جائے اُس کے اعمال سلب ہو جاتے ہیں اور ساری کوششیں رائگا[ں]

جاتی ہیں اور ان کی پسند یہی ہے کہ یہیں صرف حیاتِ دنیا ہی میں پوری ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اسی طرح غالباً ابنِ مسعود کے ذہن میں بھی یہ بات موجود تھی کہ وہ کبھی عقبہ ابنِ ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور دُنیا کی کشادگی، راحت دولت اور نعمت سب ان سے مُنہ پھیرے ہوئے تھیں۔ ان کو یاد تھا کہ جب حضورؐ نے اپنے لئے اور اپنے ساتھی کے لئے ابن ابی معیط کی بکری کا دودھ مانگا تھا اور انہوں نے انکار کیا تھا تو حضورؐ ان کی اس امانت داری سے خوش ہوئے تھے۔ انہیں یہ بھی یاد تھا کہ حضورؐ نے ان کو اپنی نجی زندگی کا امین بنایا تھا، ان کو اپنے ساتھ رکھا تھا اور اپنا خاص مقرّب بنایا تھا۔ انہیں یہ بھی یاد تھا کہ ایک دن حضورؐ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ان کی سوکھی ہوئی پنڈلیاں حشر کے دن میزان میں بعضوں سے زیادہ وزن دار ثابت ہوں گی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ان کے ایمان میں، ثابت قدمی میں، امانت داری میں اور اس کو برقرار رکھنے میں اپنے خلیلؐ کی وفاداری میں اور امت کی خیر خواہی میں اور اضافہ ہی ہوتا گیا۔

عمار جب تک خدا کو منظور ہوا کوفے کے امیر رہے۔ وہ بہت سیدھے سادے شریف آدمی تھے۔ ان کی کسی بات میں کوئی فرق نہ آیا ——— خاموشی زیادہ اور باتیں کم، لوگوں میں عام آدمیوں کی طرح گھل مل کر رہنا، عدل قائم کرنا، انصاف سے فیصلے کرنا، دین کی خیر خواہی جسمیں نہ کوئی تکلّف نہ زیادتی، جیسے پہلے تھی ویسی ہی اب بھی رہی۔ ایک دن ان سے کوئی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے پوچھا:

"کیا ایسا واقعہ کہیں ہُوا ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا "نہیں"

اُنہوں نے کہا: "تو پھر چھوڑو اس کو۔ جب یہ وقوع میں آئے گا تو ہم غور و فکر کی مشقت بھی بروقت اُٹھالیں گے۔"

یہ اپنی ضروریات کے لئے اسی طرح باہر نکلتے تھے جس طرح عام لوگ نکلتے ہیں۔ ایک شخص نے دیکھا کہ اُنہوں نے ایک درہم کا غلّہ خریدا تو اس سے رسی بھی مانگی۔ دوکاندار نے رسّی دینے سے انکار کیا، تو اُنہوں نے جھگڑنا شروع کیا اور آخر آدھی رسّی لے ہی لی۔ اور گٹھڑی باندھ کر اپنی پیٹھ پر لادی اور گھر روانہ ہوگئے۔ اس وقت یہ امیر تھے لیکن نہ ایسی باتوں کو عیب سمجھتے تھے اور نہ اسے اپنی پوزیشن کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور لوگ بھی یہ خیال نہ کرتے تھے کہ ایک امیر کے لئے جس منزلت کی ضرورت ہے اس میں وہ کمی کر رہے ہیں۔ عمار کی ذات کو اگر کسی سے کوئی تکلیف پہنچتی تو انہیں کوئی غصّہ نہ آتا لیکن اگر کہیں خدائی حق یا انسانی حق کا معاملہ درپیش ہوتا تو پھر جلال آجاتا تھا اور وہ اس وقت تک دم نہ لیتے جب تک حق واپس نہ لے لیں یا معاملے کو اصلیّت تک نہ پہنچا دیں۔ ان کو ایک بار معلوم ہوا کہ کسی نے عمر سے ان کی شکایت کی ہے تو اُنہوں نے کہا:

"اے اللہ! اگر اس نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہو تو اسے دنیا میں کشادگی عطا فرمادے اور اس کا انجام بھی بخیر کیجیو۔"

ایک موقعے پر اہلِ کوفہ کا لشکر لے کر اہلِ بصرہ کی مدد کو پہنچے۔ جب اللہ نے فتح دی تو ایک بصری نے کہا:

"اے نکٹے! کیا تم بھی ہماری غنیمت میں شریک ہونا چاہتے ہو؟"

(ہنس کر) "اے بھئی میں نکٹا نہیں کن کٹا ہوں۔" (جنگ یمامہ میں

ان کا ایک کان کٹ گیا تھا)

اہل بصرہ نے عمار اور ان کے ساتھیوں کو اپنی غنیمت میں شریک کرنے سے انکار کر دیا مگر عمار نے حق لے کر چھوڑا۔ لوگوں نے عمر کو لکھ بھیجا۔ عمر نے انہیں جواب دیا غنیمت اس کا حق ہے جو جنگ میں شریک ہو۔ اس لئے عمار اور ان کے ساتھیوں نے اپنا حق ہی تو لیا ہے۔ عمر اپنے امیروں کو مختلف شہروں میں بدل بدل کر بھیجا کرتے تھے اور کسی کے عہدے کو زیادہ طویل عرصے تک برقرار نہ رکھتے تھے۔ جب عمار سبکدوش ہوئے اور دونوں کی ملاقات مدینے میں ہوئی تو عمر نے پوچھا:

"کیا تمہیں میرا معزول کرنا برا لگا؟"

"اگر آپ دریافت ہی کرتے ہیں تو واقعہ تو یہ ہے کہ آپ کا مجھے امیر بنانا بھی ناگوار تھا اور معزول کرنا بھی۔"

اس کے بعد عمار نے اپنی زندگی عبادت و طاعت، امر بالمعروف اور تعلیم دین کے لئے وقف کر دی۔ یہ سلسلہ بقیۂ دورِ فاروقی سے لے کر عہدِ عثمانی کے ابتدائی زمانے تک ایک طرح جاری رہا۔ ایک دن عمار کو معلوم ہوا کہ عثمانؓ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا امیر مقرر کیا ہے۔ یہ عمار کو بہت ناگوار ہوا اور طبیعت میں بہت تلخی پیدا ہو گئی۔ لیکن انہوں نے اسے اپنے دل سے باہر زبان پر نہ آنے دیا، کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ وہ اس آیت قرآنی کو جس میں عبداللہ بن ابی سرح کی طرف اشارہ ہے، یاد کرتے رہے۔ وہ آیت یہ ہے:

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن
بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب

من اللہ ولھم عذاب الیم۔

جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور اس کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اس سے مستثنیٰ وہ ہے جس کو مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ وہ نہیں جو کھلے دل سے کفر اختیار کرے۔

مسلمان سمجھتے تھے کہ من شرح بالکفر صدرا (جو کھلے دل سے کفر کرے) میں عبداللہ بن ابی سرح ہی کی طرف اشارہ ہے۔

عمار اپنے دل میں کہتے کہ عبداللہ بن ابی سرح بالکل اخیر میں اسلام لایا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی تائب ہو کر ٹھیک ہو گیا ہو اور اللہ نے اس کے کفر کے بوجھ کو ایمان لانے کے بعد دور بھی فرما دیا ہو۔ مگر عبداللہ بن ابی سرح کے کردار سے مصریوں کو شکائتیں پیدا ہونگی۔

اس کے بعد واقعی بکثرت شکائتیں آنے لگیں اور برائیاں پھیلنے لگیں اور مدینے کے مہاجرین وانصار میں بھی ناراضی پھیلنے لگی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے اور اکٹھا ہو کر رائے زنی تک کرنے لگے۔ عمار خود اپنی طرف سے اور دوسرے مسلمانوں کی طرف سے نمایندہ بن کر عثمان کے پاس گئے تاکہ ان کے مقرر کردہ والیوں اور امیروں کے متعلق لوگوں کی رائے ان پر ظاہر کر دیں لیکن عثمان نے ان کی رائے کو صحیح تسلیم نہیں کیا اور دونوں کی بحث یہاں تک بڑھ گئی کہ عثمان نے ان کو نکال باہر کرنے کا حکم دیدیا اور عثمان کے غلاموں نے ان کو باہر کر دیا اور اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے اور لوگ سمجھے کہ چل بسے۔ مگر عمار کو افاقہ ہوا تو وہ بولے:

"اے اللہ کی راہ میں ہم پہلے بھی بہت کچھ سزائیں جھیل چکے ہیں۔"

(۲۵)

عمار کی سبکدوشی کے بعد سے عبداللہ بن مسعود کوفے ہی میں رہے۔ اور لوٹ کر مدینے نہ آئے، وہ اپنے عہدے پر قائم تھے اور بدستور بیت المال کے امین۔ لوگوں کے معلم اور والیوں کے مشیر رہے۔ وہ لوگوں کو بڑے حسن وخوبی سے تعلیم دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے لوگ ان سے محبت کرتے، خوش رہتے۔ ابن مسعود نے لوگوں کے دلوں پر اپنا گہرا نقش پیدا کر لیا تھا۔

اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ عبداللہ بن مسعود حضور سے عرصۂ دراز تک وابستہ رہے تھے حتیٰ کہ لوگوں کو یہ گمان ہو گیا تھا کہ وہ بھی شاید بیت نبوی کے ایک رکن ہیں۔ حضور کی زبان سے سن کر انہوں نے ستر سورتیں یاد کر لی تھیں اور اس میں اُن کے مقابلے کا کوئی آدمی نہ تھا۔ حضور ان کی قرأتِ قرآن کو پسند فرماتے اور لوگوں کو یہ فرما کر ترغیب دیتے کہ:

"جسے یہ پسند ہو کہ قرآن کو اسی عمدگی سے پڑھے جس طرح وہ نازل ہوا ہے تو ابن اُم عبد کی طرح پڑھے۔"

عبداللہ حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلنے میں بڑے سخت تھے۔ گفتگو، کام، حرکت، سکون، لوگوں سے بات کرنا، لوگوں کی بات سننا، اُلجھنیں پیش آئیں تو ان کو سلجھانا، مصیبت آئے تو ثابت قدم رہنا، غرض ان تمام باتوں میں وہ حضورؐ کی پوری پوری اقتداء کرتے تھے۔ ان کے جاننے والے تمام صحابہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عبداللہ بن مسعود سیرت، اخلاق اور

انداز میں حضورؐ سے بے حد مشابہ تھے۔ حذیفہ بن یمان کا کہنا ہے کہ:

"ابنِ مسعود حضورؐ کی سیرت، اخلاق اور انداز کی مشابہت تمام لوگوں سے زیادہ رکھتے ہیں تاآنکہ ان کے گھر کی دیواریں ان کو چھپالیں (یعنی گھر کے اندر کا حال ہمیں نہیں معلوم)

اپنے قیامِ کوفہ کے دوران میں وہ لوگوں کو قرآن پڑھاتے اور ہر جمعرات کو وعظ کہتے۔ ایک عصا پر ٹیک لگا کر تقریر کرتے اور مسلسل بولتے رہتے اس کے بعد چُپ ہو جاتے۔ ان کے سُننے والوں کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ بات بیان کریں جس میں کوئی حدیث بھی ہو۔ لیکن وہ کسی بات سے اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا حدیث نبوی بیان کرنے سے۔ اس معاملے میں ان کا شمار ان محتاط لوگوں میں تھا جو حضور کی زبان سے یہ سُن چکے تھے کہ

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

جو جان بوجھ کر میرے متعلق جھوٹی باتیں بیان کرے وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

اور حضورؐ کی حدیث بیان کرنے سے ڈرتے تھے کہ کہیں نادانستہ بھی اس میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ ایک بار دورانِ وعظ میں عبداللہ بن مسعود کی زبان سے "قال رسول اللہ" نکل گیا تو اس کے زبان پر آتے ہی سارے جسم میں سخت کپکپی پیدا ہو گئی، عصا بھی کانپنے لگا اور پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگا اور فوراً انہوں نے کہہ دیا کہ:

او فوق ھذا او نحو ھذا او دون ھذا۔

حضور نے ایسا ہی یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم فرمایا

کوفے کے لوگ کسی والی سے اتنا خوش نہ رہے جتنا عبداللہ بن مسعو

ابو موسیٰ اشعری سے راضی رہے۔ عمر کی وفات کے بعد بھی یہ کوفے میں
یت المال کے نگران رہے۔ عثمان نے بھی ان کو اسی خدمت پر قائم رکھا۔
تی کہ ولید بن عقبہ کوفے کا والی ہوا اور کچھ واقعات ایسے ہو گئے کہ عبداللہ
ن مسعود کو مخالفت کرنی پڑی۔ ان واقعات سے پہلے ابن مسعود عثمان سے
ہت خوش تھے۔ ان کا ذکر بڑے اچھے اور دعائیہ الفاظ میں کرتے تھے۔

---

(۲۶)

یہ واقعات کچھ تو کوفے میں ہوئے اور کچھ مدینے میں۔ کوفے میں یہ حادثہ پیش آیا کہ بیت المال میں کچھ ایسا تصرف ہونے لگا جس سے عبداللہ بن مسعود آشنا نہ تھے اور نہ مطمئن و خوش۔ یعنی ولید نے بے دریغ روپیہ اڑانا شروع کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کے مال میں تصرّف کا اسے پورا حق حاصل ہے۔ عمر کے زمانے سے ابن مسعود بھی جانتے تھے کہ بیت المال مسلمانوں کا حق ہے نہ کہ حکمرانوں کا۔ اور امیر کے لئے اس کو وہیں صرف کرنا جائز ہے جہاں حق ہو یا عام مسلمانوں کے نفعے کی بات ہو۔

بیت المال کی اس نئی سیاست و انتظام میں ولید بن عقبہ کا کردار ایسا تھا کہ کوفے کے اچھے لوگ بھی اس سے خوش نہ تھے۔ اور جو بات عام لوگوں کو ناپسند تھی وہ ابنِ مسعود کو بھی ناگوار تھی۔ ولید کو ابنِ مسعود کی یہ ناخوشی بری لگی۔ دونوں میں اختلاف بڑھتا گیا۔ عام لوگ ابنِ مسعود کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ان سے محبّت بھی زیادہ کرتے تھے اور ان کی بات پر دھیان بھی زیادہ دیتے تھے۔

اُدھر مدینے میں جو نیا واقعہ ہُوا وہ عثمان کا یہ اقدام تھا کہ قرآن کو ایک مصحف میں ایک ہی قرأت پر جمع کر دیا جائے۔ عثمان نے اس کام کیلئے حافظوں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی جس کے صدر زید بن ثابت تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عثمان اس کام میں مسلمانوں کی خیر خواہی کا ہی جذبہ رکھتے تھے اور پسند نہ کرتے تھے کہ کتاب اللہ میں لوگ مختلف قرأتیں اختیار

کریں۔ جب مصحف جمع ہو گیا تو انہوں نے اس کو تمام شہروں میں پھیلا دیا، اور ان تمام قرأتوں کو ممنوع قرار دیا جو اس مصحف میں درج نہ ہوں اور مصحف امام کے جمع ہونے سے پہلے ان تمام صحیفوں کو جن میں قرآن لکھا ہوا تھا جلا ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ ابن مسعود کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ وہ قرأت قرآن میں سب پر فائق تھے۔ انہوں نے عثمان کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ عثمان کے اس اقدام پر اور نیز کوفے میں ولید کی حرکتوں پر تنقید بھی کرنے لگے۔ جب وہ ہر جمعرات کو حسب معمول تقریر کرتے تو اس میں یہ الفاظ بھی ہوتے:

ان اصدق القول کتاب اللہ، واحسن الهدی هدی محمد و شر الامور محدثاتها، وکل محدث بدعة، وکل بدعة ضلالة، وکل ضلالة فی النار۔

سب سے زیادہ سچی بات کتاب اللہ ہے، بہترین سیرت محمدؐ کی سیرت ہے، سب سے بری بات کوئی نئی دینی بات پیدا کرنا ہے، ہر نئی بات بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔

ولید نے ان جملوں کو اپنے حق میں اور عثمان کے حق میں تعریض و طنز خیال کیا اور ابن مسعود سے فرمائش کی کہ یہ باتیں آپ دوبارہ نہ کہیں۔ مگر ابن مسعود نے نہ اس کی پروا کی نہ ادھر کوئی توجہ دی۔ تو اس نے پوری تفصیل عثمان کو لکھ بھیجی۔ عثمان نے جواب دیا کہ ابن مسعود کو وہاں سے نکال دو اور میرے پاس بھیج دو۔ ابن مسعود جب روانہ ہوئے تو لوگ ان کو رخصت کرنے شہر کے باہر تک آئے۔ لوگ مغموم تھے اور اصرار کر رہے تھے، کہ

آپ یہیں رہیئے۔ کیونکہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ عثمان ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار برتاؤ نہ کریں۔ لوگ یہ وعدہ کر رہے تھے کہ ہم یہاں آپ کی پوری حمایت کریں گے اور کوئی گزند نہ پہنچنے دیں گے۔ مگر ابن مسعود نے یہ کہہ کر رُکنے سے انکار کر دیا کہ: "یہ تو ہونا ہی ہے۔ پھر میں اس کی ابتدا اپنی طرف سے کیوں کروں؟"

وہ رات کے وقت مدینے پہنچے۔ صبح کے وقت مسجد میں گئے۔ اس دن جمعہ تھا۔ عثمان نے ان کو دیکھا تو منبر کے اوپر ہی سے ان کو سخت سُست کہنا شروع کیا۔ ابنِ مسعود نے جواب دیا:

"میں ویسا نہیں ہوں جیسا آپ فرما رہے ہیں۔ میں بدر، اُحد، خندق اور بیعت رضوان میں حضورؐ کے ساتھ رہا ہوں"

پردے کے پیچھے سے عائشہ نے آواز دی:

"ہے ہے عثمان! تم رسول اللہ کے صحابی کو ایسی باتیں کہہ رہے ہو؟"

عثمان نے عائشہ کو جواب دیا:

"آپ چُپ رہیئے"

اس کے بعد ایک غلام کو حکم دیا کہ ابن مسعود کو مسجد سے نکال باہر کرو۔ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام غلام آگے بڑھا۔ اس نے ابن مسعود کو معلّق اُٹھایا ابن مسعود کوشش کرتے رہے کہ اس سے اپنی جان چھڑائیں۔ وہ اپنے دونوں پاؤں اس کے مونڈھوں پر ہلاتے جا رہے تھے اور عثمان سے مخاطب ہو کر چلّا رہے تھے کہ:

"تمہیں خدا کا واسطہ، مجھے میرے خلیل کی اس مسجد سے تو باہر نہ کرو"

مگر وہ غلام ان کو اُٹھا ہی لے گیا اور مسجد کے دروازے کے پاس آ کر

اس نے ان کو زمین پر اس زور سے دے مارا کہ ان کی پسلی کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی اور بڑے کرب کی حالت میں انہیں گھر لے جایا گیا۔

معاملہ یہیں تک نہیں رہا بلکہ عثمان نے دو سال تک ان کا وظیفہ بند رکھا۔ ابن مسعود مدینے میں امیر المومنین کے معتوب رہے۔ حتیٰ کہ جب مرض موت میں مبتلا ہوئے تو عثمان کو معلوم ہوا کہ وہ لب مرگ ہیں۔ یہاں سے روائتیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ عثمان سے ناراض تھے ان کا بیان ہے کہ: عثمان ابنِ مسعود کے پاس معذرت لے کر گئے، وظیفہ پیش کیا اور اپنے لئے استغفار کی درخواست کی۔ مگر ابنِ مسعود نے ان میں سے کسی بات کو قبول نہ کیا۔ عثمان نے ام المومنین امِ حبیبہ کو درمیان میں واسطہ بنایا مگر ابن مسعود نے اس واسطے کو بھی قبول نہ کیا۔ اور ابنِ مسعود کا ایسی حالت میں انتقال ہوا۔ کہ ان کے اور عثمان کے درمیان تعلقات انتہائی طور پر کشیدہ تھے"۔

جو لوگ عثمان پر نکتہ چینی کرتے تھے وہ اور بھی مبالغہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابنِ مسعود نے یہ وصیّت کی تھی کہ عثمان میرے جنازے کی نماز میں نہ شریک ہوں اور عمار بن یاسر نے یہ وصیّت قبول کر لی تھی اور اسے پورا بھی کیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ عمار پر عثمان کا غصّہ اور بڑھ گیا تھا۔

لیکن جن لوگوں کو عثمان سے محبّت ہے اور وہ تمام مہاجرین سے حُسنِ ظن رکھتے ہیں وہ یہ بتاتے ہیں کہ: عثمان ابنِ مسعود کی علالت میں عیادت کے لئے آئے اور معذرت پیش کی، تو اُنہوں نے معذرت قبول کر لی تھی اور دونوں نے ایک دوسرے کے لئے اللہ سے مغفرت بھی طلب کی تھی اور ابن مسعود کی رحلت کے بعد عثمان نے نماز جنازہ بھی پڑھی اور ان کی قبر پر کھڑے ہو کر ان کو بہت اچھے لفظوں سے یاد بھی کیا۔ ان دونوں کی سیرت کو دیکھتے ہوئے

یہی بیان زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

پھر زبیر بن عوام عثمان کے پاس گئے۔ ان کو اس کی وصیت ابن مسعود نے کی تھی۔ زبیر نے کہا:

"ابنِ مسعود کا وظیفہ مجھے دے دیجئے۔ کیونکہ اس کا استحقاق ان کے بال بچوں کو بیت المال سے زیادہ پہنچتا ہے۔"

عثمان نے اس کی تائید کی اور زبیر کو ابن مسعود کا وظیفہ دوگنا دیا۔ اُنہوں نے بیت المال کے خازن کو حکم دیا اور اس نے زبیر کو پچیس ہزار کی رقم ادا کی۔

چند سال کے بعد اہلِ کوفہ جب علی کے گرد جمع ہوئے تو ابن مسعود کا ذکر کر کے کہنے لگے کہ:

"امیر المومنین! ہم نے تو ابن مسعود سے زیادہ خوش خلق اور تعلیم میں ان سے زیادہ نرم، ان سے بہتر مجلسی اور ان سے بڑھ کر عبادت گزار کوئی آدمی نہیں دیکھا۔"

"میں تمہیں قسم دے کر دریافت کرتا ہوں کہ تم یہ بات سچے دل سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں یا امیر المومنین"۔

"تو اے اللہ میں تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں بھی ان کے بارے میں وہی کہتا ہوں جو یہ لوگ کہتے ہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔"

(۲۰۷)

مدینے کا کوئی شخص عثمان کی مخالفت میں اتنا پیش پیش نہ تھا جتنے عمار بن یاسر تھے۔ حضورؐ کے فرمان کے مطابق یہ فطرت پر قائم تھے۔ وہ گول مول باتیں پسند نہ کرتے تھے، نہ گھما پھرا کے باتیں کرنے والوں کو اچھا سمجھتے تھے۔ عمار بات وہ پسند کرتے جو بالکل صاف ہو، کام وہ جو بالکل نکھرا ہوا ہو، کردار وہ جس میں راستی اور پختگی ہو اور ٹیڑھ سے پاک ہو۔ خالص دین انکی فطرت کا جزو اور مزاج کا ایک حصہ تھا۔ دنیا کو سب سے زیادہ حقیر سمجھتے، منافع دنیا کو کم سے کم حاصل کرتے، فتنے سے بہت زیادہ ڈرتے اور پیچیدہ سیاست سے بہت زیادہ بھاگتے، حق پسند تھے اور حق ہی کی طرف لپکتے تھے۔ حق کے سوا کوئی چیز پسند نہ کرتے اور حق کے سوا کسی اور طرف نہ جاتے۔ حضور کی سیرت میں اور ابو بکر و عمر کی سیرت میں راستی تھی اور کوئی کجی نہ تھی، صفائی تھی اُلجھاؤ سے پاک۔ اور ان کے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ حکومت کے معاملات ہمیشہ ایسے ہی دو ٹوک ہونے چاہئیں جیسے حضور اور شیخین کے وقت میں تھے۔ جب انہوں نے عثمان کے زمانے میں معاملات کی پیچیدگی، مفادات کا ٹکراؤ اور خواہشوں کا اختلاف دیکھا تو یہ بات ان پر سخت گراں گزری۔ وہ اسے دل میں دبا نہ سکے اور ان کی فطرت اس پر مطمئن نہ ہو سکی۔ ان کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے ان کو پہلے تو وہ دل میں گھونٹتے رہے اور عرصے تک خاموشی اختیار کئے رہے۔ وہ فتنے سے اس قدر پناہ مانگتے تھے کہ کوئی انسان کیا مانگے گا۔ پھر انہوں نے لوگوں کو

اعتراض کرتے سنا اور دیکھا۔ تو سنجیدگی سے غور کرنے لگے، اندازہ لینے لگے اور ڈوب ڈوب کر جائزہ لیا۔ آخر کار دوسروں کی طرح عمار کے دل میں بھی اعتراض اور مخالفت نے جڑ پکڑ لی۔ مگر یہ خاموش ہی رہے اور فتنے سے اللہ کی پناہ مانگتے رہے۔ لیکن جب بڑے بڑے عمر رسیدہ صحابۂ رسول کو اور خصوصاً مہاجرین کو بھی اعتراض کرتے سُنا تو حق ان پر زیادہ واضح ہو گیا۔

ایک دن لوگ مدینے میں یہ باتیں کرنے لگے کہ عثمان نے بیت المال سے ایک انگوٹھی لے لی ہے اور اپنی کسی بیوی کو پہنا دی ہے۔ مہاجرین و انصار میں چہ میگوئیاں کافی بڑھیں تو ایک دن عثمان منبر پر آئے اور اعلان کیا کہ:

"ہم بیت المال سے اپنی ضرورت کی چیز بے شک لے لیتے ہیں کسی کو یہ بات ناگوار ہوتی ہو تو ہو"۔

"پھر آپ کو اس سے روکا بھی جا سکتا ہے"، علی نے کہا

"خدا شاہد ہے کہ سب سے پہلے یہ بات مجھے ناگوار گذری"۔ عمار بولے

علی کی بات پر تو عثمان چپ رہے مگر عمار کی بات پر بہت ناراض ہوئے اور بُرا بھلا بھی کہا اور بعض روایت کے مطابق یہی پہلی بُرائی تھی جس کا نتیجہ آگے چل کر یوں ظاہر ہوا کہ عثمان نے عمار کو اتنا پٹوایا کہ وہ عارضۂ فتق میں مبتلا ہو گئے۔ ان پر ایسی غشی طاری ہوئی کہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں قضا ہو گئیں اور جب ہوش آیا تو وضو کر کے سب کو ادا کیا اور اُن کو وہ سزائیں یاد آ گئیں جو اسلام کے جرم میں انہیں قریشی دیا کرتے تھے۔ اسی دن سے ان کی مہرِ سکوت ٹوٹ گئی اور اب اُٹھتے بیٹھتے وہ عثمان پر کڑی تنقید کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جب مختلف شہروں سے لوگ چڑھ آئے تو عمار نے نہ ان پر

ملامت کی نہ ان کو واپس کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد عثمان قتل کر دیئے گئے اور عمار کو اس کا کوئی صدمہ نہ ہوا۔ بلکہ بعض اوقات تو عمار اس پر بھی بحث کر جاتے کہ عثمان مومن مرے یا کافر۔ حسن بن علی سے بھی عمار کی یہ بحث ہوئی۔ حسن کہتے تھے کہ عثمان مومن مرے اور عمار کہتے تھے کہ نہیں کافر مرے۔ دونوں میں سخت مباحثہ ہوا اور معاملہ علی تک پہنچا تو علی نے نرمی سے عمار کو اس قسم کے مناظرے سے روک دیا۔

قتل عثمان کے بعد عمار کسی بات میں اتنے سخت نہ تھے جتنے علی کی حمایت میں اور خصوصاً اس وقت اور بھی زیادہ جب علی اور معاویہ کے درمیان جنگ چھڑی۔ عمار کے قلب وضمیر پر حق واضح ہو چکا تھا اور ایک لحظے کے لئے بھی ان کو شک نہ تھا کہ علی اور ان کے ساتھی حق پر ہیں اور معاویہ اور ان کے رفقاء باطل پر۔ حضور کی وفات کے بعد عمار کسی جنگ میں اتنے خلوص نیت اور ایسی للٰہیت سے نہیں گئے تھے جیسے جنگ صفین میں گئے۔ ان کے دل میں حضور کا یہ فرمان کہ: "تمہیں ایک باغی جماعت قتل کرے گی" جم کر رہ گیا تھا اور یہ فرمان اس وقت تو بڑی وضاحت اور صفائی کے ساتھ آئینہ ہو کر ان کے سامنے آ گیا جب وہ علی اور اصحاب علی کے ساتھ صفین کے ارادے سے چلے۔ اس وقت عمار کو اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ معاویہ اور اصحاب معاویہ باغی ہیں۔ انہیں اس میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ یہ لوگ پیغمبر کے عمزاد بھائی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ وہ ان جنگوں سے بہت مشابہ ہے جو قریش نے خود پیغمبر کے خلاف — بدر، احد اور خندق کے موقعوں پر — کی تھی۔ لہذا عمار جنگِ صفین کی طرف اپنی بصیرت کی بنیاد پر بڑھے۔ انہوں نے اپنا دل اللہ کے لئے خالص کر لیا تھا، اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا تھا اور صفین میں اسی طرح

شہادت کے خواہش مند تھے جس طرح حضورؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شہادت کے طالب تھے۔

وہ جب صفین کی طرف جاتے ہوئے فرات کے کنارے پہنچے تو بعض لوگوں نے ان کو یہ کہتے سُنا کہ:

"اے اللہ! اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ تو میری اس بات سے خوش ہوگا کہ میں اس پہاڑ پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دوں، تو میں ایسا ہی کر لیتا۔ الٰہی اگر مجھے علم ہوتا کہ تو میری اس بات سے راضی ہوگا کہ میں پانی میں کود کر ڈوب جاؤں تو میں یہی کرتا۔ میں صرف اس لئے یہ جنگ کر رہا ہوں کہ تیری رضا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں تیری رضا چاہتا ہوں تو تو مجھے نامراد نہ کرے گا۔"

اس وقت عمارؓ نوّے سال سے اوپر جا چکے تھے۔ مگر نظر یہ آتا تھا کہ قوّت جوانی اور چستی اس طرح لوٹ آئی ہے جو پہلے کبھی نہ تھی۔ جنگ میں سب سے تیز، اور بیٹھنے اور دم لینے سے متنفر سب سے بڑھ کر متنفر۔ موت کے سب سے زیادہ خواہشمند اور زندگی سے سب سے بڑھ کر بیزار۔ انہیں واقعتہً بلا کسی شائبہ شک کے یہ یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں اور فی سبیل اللہ جنگ کر رہے ہیں۔ صفین کی یہ جنگ دونوں فریقوں میں ہر روز تیز سے تیز تر ہوتی گئی جب تیسرا دن ہوا تو معاویہ نے کہا:

"آج مجھ پر عرب بے حد ناراض ہوں گے۔ اس سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ ان پر اس غلام کی خفّت ظاہر ہو جائے۔"

غلام سے معاویہ کی مراد عمارؓ تھے اور خفّت سے عمارؓ کی جنگی دلچسپی اور جنگی چالوں سے ان کی ناواقفیت ثابت کرنا۔

اس دن عمار سارا دن جنگ کرتے رہے اور لوگوں کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ ایک گندم گوں اور دراز قد بڈھا ہے، جس کے ہاتھ میں رعشہ ہے اور ہتھیار کے ساتھ کانپ رہا ہے، بجلی بنا ہوا ہے، جنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ کبھی ادھر دوڑتا ہے کبھی اُدھر بھاگتا ہے۔ کبھی ان کو للکارتا ہے کبھی اُن کو اُبھارتا ہے۔ لوگ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور آپسمیں ان کی جفاکشی کا تذکرہ بھی کرتے جاتے تھے۔ بعض مسلمان تھے تو لشکر علی میں، لیکن وہ لڑ نہیں رہے تھے۔ مثلاً خزیمہ بن ثابت انصاری جنہوں نے خود بھی عمار کے متعلق حضور کا یہ ارشاد سنا تھا کہ "تمہیں ایک باغی جماعت قتل کرے گی"۔ یہ عمار کو علی کی حمایت میں جنگ کرتے دیکھ تو رہے تھے مگر اس انتظار میں تھے کہ عمار کا انجام دیکھ لیں۔ اسی طرح بعض مسلمان میدانِ جنگ میں معاویہ کے ساتھ بھی موجود تھے مگر جنگ نہیں کر رہے تھے۔ ان کو بھی عمار کے بارے میں حضور کا یہ ارشاد پہنچ چکا تھا اور وہ بھی عمار کا آخری انجام دیکھنے کے لئے شدّت سے انتظار کر رہے تھے۔ ان ہی میں عمر بن خطاب کے غلام حُنَیٔ بھی تھے۔ اس دن عمار ایک دستے کی کمانداری کر رہے تھے۔ جنگ کرتے کرتے جب عصر کا وقت آگیا۔ اور اصیل (عصر و مغرب کا درمیانی وقت) اپنی زرد اور غمگین شعاعیں لڑنے والوں پر ڈالنے لگا تو عمار کی چُستی کچھ اور تیز ہو گئی، ان پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جیسے موت کا عشق بیدار ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے اردگرد کے لوگوں کو للکارتے اور جوش دلاتے ہوئے بلند آواز سے کہا:

"جنّت تیروں کی نوک کے نیچے ہے۔ آج میں اپنے دوستوں سے محمدؐ اور ان کے ساتھیوں سے جا ملوں گا۔"

عمار اس دن روزے سے تھے۔ آفتاب غروب ہو گیا تو اُنہوں نے کہا:

"کچھ پلاؤ"۔ اور ان کے لئے دودھ کا پیالہ لایا گیا۔ دودھ کو دیکھا تو ہنس پڑے اور کہا:
"حضور نے مجھ سے فرمایا تھا کہ دنیا میں تمہاری آخری غذا دودھ ہو گی۔
اس کے بعد تم پر موت آئے گی۔"
اس کے بعد انہوں نے لوگوں کو پھر ابھارا، پھر للکارا کہ:
"جنّت نیزوں کی نوک کے سائے میں ہے۔ پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے اور پہنچ جاتا ہے۔ آج میں اپنے دوستوں سے، محمد سے اور ان کے ساتھیوں سے جا ملوں گا۔"
لشکرِ علی کے کچھ لوگ پسپا ہوئے مگر عمار کے دل میں کوئی کمزوری نہ آئی، ان کے یقین میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ انہوں نے کہا:
"اگر یہ ہمیں مار مار کے ہجر کے نخلستان تک بھی پہنچا دیں تب بھی میرا یہ یقین اپنی جگہ رہے گا کہ میں حق پر ہوں اور یہ لوگ گمراہی پر ہیں۔"
معاویہ کا جھنڈا عمرو بن العاص کے ساتھ تھا۔ عمار نے اسے دیکھا تو بولے:
"ارے میں اس جھنڈے والے سے تو رسول اللہ کی معیت میں تین بار جنگ کر چکا ہوں، یہ چوتھی بار ہے۔"
علی کا جھنڈا ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص کے ہاتھ میں تھا۔ ہاشم یک چشم تھے۔ عمار انہیں کبھی یہ کہہ کر ابھارتے کہ: "ارے آگے بڑھ، ایک آنکھ والے!" اور کبھی بڑی دلجوئی سے کہتے کہ: "ہاشم! آگے بڑھو، تم پر میرے باپ قربان۔" ہاشم جواب میں کہتے:
"عمار! تم پر اللہ کی رحمت۔ میں جھنڈے کی پوری حفاظت کر رہا ہوں خدا سے اُمید ہے، وہ مجھے فتح دے گا اور منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔ جلد بازی میں ہلاکت ہے۔"

مگر عمار یہی کہے جاتے کہ: "تم پر میرے باپ قربان آگے بڑھو، بڑھے چلو۔" اس کے بعد ہاشم آگے بڑھے۔ اور جب عمار نے ان کو جھنڈا لے کر آگے بڑھتے دیکھا تو آس پاس کے لوگوں کو آواز دی:

"کوئی بڑھتا ہے اللہ کی طرف؟ کون آتا ہے جنّت کی طرف؟"

اس کے بعد عمار آگے بڑھے اور پھر لڑتے لڑتے وہیں شہید ہو گئے۔

خزیمہ نے عمار کی شہادت دیکھی تو بول اُٹھے:

"اب مجھ پر گمراہی بے نقاب ہو گئی۔"

پھر وہ خیمے میں گئے، غسل کیا، اپنے ہتھیار لگائے، میدان میں اُترے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

عمر بن خطاب کے غلام ہُنی کو صبح کے وقت عمار کا حال معلوم ہوا تو وہ عمرو بن العاص کے پاس پہنچے۔ وہ اپنے تخت پر بیٹھے تھے اور آس پاس کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہُنی نے کہا:

"ابو عبداللہ؟"

"کیا بات ہے؟"

"اُٹھو ذرا ایک بات کرنی ہے۔"

(تنہائی میں) "عمار بن یاسر کے بارے میں تم نے کچھ سُنا ہے؟"

"ہاں میں نے حضور کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ: تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔"

"بس تو عمار وہ مقتول پڑے ہیں۔"

"یہ غلط ہے۔"

"میری آنکھوں نے انہیں خود مقتول دیکھا ہے۔"

"مجھے دکھاؤ"

دونوں روانہ ہوگئے اور عمرو بن العاص نے ان کو لاشوں کے ڈھیر میں پڑا دیکھا تو ان کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کے بعد ایک کنارے آکر بولے :

"ان کا قاتل وہ ہے جو ان کو جنگ کے لئے باہر لایا۔"

اس دن عمار نے اپنے بعض رفیقوں سے یہ کہا تھا کہ :

"مجھے غسل نہ دینا اور مجھ پر مٹی بھی نہ ڈالنا کیونکہ میں شہید ہوں میں بروزِ حشر جھگڑوں گا۔"

جب وہ شہید ہو چکے تو علی وہاں آئے اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھی، مگر انہیں غسل نہیں دیا گیا۔ علی نے کہا :

"وہ مرد مسلم ہدایت یافتہ نہیں جس پر ابنِ یاسر کی موت شاق نہ گزرے اور اس کو شدید صدمہ نہ پہنچے۔ اللہ نے عمار پر اپنی رحمت نازل کی اس دن بھی جب وہ اسلام لائے ــ اس دن بھی جب وہ قتل ہوئے ــ اور اس دن بھی جب وہ اُٹھائے جائیں گے۔ ان پر اللہ کی رحمت سایہ افگن رہے گی۔ میں نے عمار کو دیکھا ہے کہ صحابہ رسول میں جب کسی چار کا ذکر ہوتا تو عمار چوتھے ہوتے اور جب کبھی پانچ کا ذکر ہوتا تو وہ پانچویں ہوتے۔ قدیم اصحاب نبوی میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے عمار کے جنتی ہونے میں کوئی شک ہو۔ پس عمار کو جنّت مبارک ہو۔"

یہ بھی کہا گیا ہے کہ :

"عمار حق کے ساتھ ہیں اور حق ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ عمار حق پر ہیں خواہ جدھر جائیں اور عمار کا قاتل جہنمی ہے۔"

---

(۲۸)

معاویہ کے دو رفیق معاویہ کے ہاں آئے اور ان کے خیمے میں داخل ہوئے۔ معاویہ کے ساتھ عمرو بن العاص اور ان کے فرزند عبداللہ بن عمرو اور چند اور رفقاء بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے جو ابھی اندر آئے تھے قتل عمار کے بارے میں باہم جھگڑنا شروع کیا۔ ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ قاتل عمار وہی ہے۔ عبداللہ بن عمرو نے کہا: "تم میں سے کوئی ایک دوسرے کے حق میں خوش دلی کے ساتھ دستبردار ہو جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ تم دونوں کا جھگڑا جہنم کے بارے میں ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور ان کا قاتل و سالب جہنمی ہے۔"

معاویہ نے عمرو بن العاص سے کہا: "ذرا اپنے اس پاگل صاحبزادے کو سمجھائیے۔"

پھر عبداللہ کی طرف مخاطب ہو کر: "اگر تمہاری یہی رائے ہے تو تم ہم لوگوں کے ساتھ کیوں ہو؟"

"میرے والد نے حضورؐ سے ایک بار میری شکایت کی تھی تو حضورؐ نے مجھے زندگی بھر ان کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں مگر جنگ نہیں کر رہا ہوں۔"

"عمار کو ہم نے قتل نہیں کیا۔ ان کا قاتل وہ ہے جو انہیں میدانِ جنگ میں اپنے ساتھ لایا۔"

معاویہ کے حق میں تمام باتوں کا فیصلہ ہو جانے کے بعد ایک رات عمرو بن العاص اپنے رفیقوں کے ساتھ بیٹھے تھے، کہ ایک شخص نے کہا:

"اے ابو عبداللہ (عمرو بن العاص)، ہم سمجھتے ہیں کہ حضورؐ تم سے بہت محبت کرتے تھے اور تمہیں عامل بنا کر بھی بھیجا کرتے تھے۔"

"حضورؐ مجھے عامل بنا کر تو بھیجتے تھے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ حضورؐ مجھ سے واقعی محبت کرتے تھے یا محض اظہارِ شفقت فرماتے تھے۔ البتہ ہم دو ایسے آدمیوں کو جانتے ہیں کہ حضورؐ وفات کے وقت تک ان دونوں سے محبت فرماتے تھے اور ان سے راضی اور خوش تھے۔"

"کون تھے وہ دونوں؟"

"عبداللہ بن مسعود اور عمار بن یاسر۔"

"عمار بن یاسر بھی؟ تو ان کو تمہیں لوگوں نے تو صفین میں قتل کیا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ ان کے قاتل دراصل ہم ہی لوگ ہیں۔"

عمار جس دن شہید ہوئے اس دن وہ ایک فوجی دستے کے افسر تھے، اور ان کے مقابلے میں معاویہ کا جو دستہ تھا اس کے افسر ذوالکلاع حمیری تھے۔ یہ دونوں (عمار اور ذوالکلاع) قتل ہوئے۔ ابنِ سعد اپنے راویوں کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ:

"میں نے خواب میں سرسبز و شاداب باغ دیکھا جس میں خیمے نصب تھے اور ان میں عمار تھے اور دوسری طرف خیمے نصب تھے جن میں ذوالکلاع تھے میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے؟ اِن دونوں نے تو باہم جنگ کی تھی تو جواب ملا کہ یہ ایسے رب سے جا ملے ہیں جس کی مغفرت بڑی وسیع ہے۔"

---

(۲۹)

بیان کرنے والا اس بیان کے بعد دیر تک سر جھکائے رہا۔ سننے والے یہ سمجھے کہ یہ اور کوئی بات نہیں کہیگا۔ لہذا اُنہوں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ تو اس نے اپنا سر اُٹھایا اور انہیں مخاطب کر کے یہ آیت تلاوت کی :

ونرید ان نمنّ علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلہم ائمۃ ونجعلہم الوارثین ونمکن لہم فی الارض ونری فرعون وھامان وجنودھما منہم ما کانوا یحذرون۔

ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے ان پر احسان کریں، انہیں امام بنائیں، وارث بنائیں، ان کو زمین پر اقتدار بخشیں اور فرعون، ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھادیں جس سے وہ ڈرتے تھے اور حذر کرتے تھے۔"

اس کے بعد اک ذرا سکوت اختیار کر کے اس نے پھر کہا ۔

" اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان زیر دستوں کو اپنی زمین کا وارث بنایا، قیصر و کسریٰ کی حکومت چھین کر انہیں دے دی، یہ لوگ جب تک زندہ رہے امام بنے رہے اور جب اللہ نے ان کو اپنے جوار کے لئے پسند کر لیا تو انہیں اپنی نعمتوں سے نوازا ان کی یاد کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھا، ان کی سیرت کو رضائے الٰہی کا ذریعہ بنایا، ان کی زندگی کو قابل اقتدا اور بہترین نمونہ بنایا۔ اور اس وقت تک مسلمانوں کے امام رہیں گے جب تک اللہ زمین اور اہلِ زمین کا وارث ہو جائے۔

مترجم کی دوسری قابلِ دید تصانیف

مقامِ سنّت — اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وحی کے کیا معنی ہیں۔ اس کی کتنی قسمیں ہیں۔ حدیث اور سنّت میں کیا فرق ہے۔ حدیث کا کون سا حصّہ واجب العمل ہے اور کون سا وقتی اور شخصی۔ کون سا حصّہ وحی اور کون سا غیر وحی۔ نیز حدیث اور قرآن کے اعلیٰ مقام کیا ہیں وغیرہ وغیرہ تو یہ تمام مباحث سلجھے ہوئے سلیس انداز میں آپ کو اس کتاب میں ملیں گے۔ قیمت ۲ دو روپے۔

ریاض السنّت — کتب احادیث کے وسیع ذخیرے کا ایسا انتخاب ہے جو اب تک کہیں نہیں ہوا۔ اس میں اعلیٰ اقدار، ادبی شاہکار، ترقی پسندی، دینی یُسر و سہولت وغیرہ سے متعلق جتنی احادیث ہیں سب سلیس ترجموں کے ساتھ یکجا کر دی گئی ہیں۔ فقہ جدید کی ترتیب میں بھی اس سے غیر معمولی مدد ملے گی۔ بیس صفحے کا نہایت اعلیٰ مقدمہ بھی ہے اور ہر حدیث کے ساتھ ایک پھڑکتا ہوا عنوان بھی ہے قیمت آٹھ روپے

ازدواجی زندگی کیلئے اہم قانونی تجاویز — اس میں نکاح، طلاق، خلع، مہر، جہیز، ولیمہ عدالتی نظام، تعدد ازدواج وغیرہ کے متعلق نہایت متوازن اور مستند تجاویز ہیں جن میں سے ہر ایک کے لئے کتاب و سنت و فقہ کے مستند حوالے دیئے گئے ہیں۔ میرج اینڈ فیملی لاز کمیشن کی تجاویز مرتب کرتے وقت اس کے ارکان کے سامنے یہی کتاب پیشِ نظر تھی۔ ہر تجویز میں عصری

تقاضوں کا لحاظ رکھ کر ترقی پسندانہ قدم اُٹھایا گیا ہے۔ قیمت ۱۵ار

الدّین یسرٌ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دین آسان سی چیز ہے۔ یہ کتاب اسی حدیث نبوی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد آپ یہ محسوس کریںگے کہ دین فی الواقع ایک آسان سی چیز ہے لیکن بہت سے غلط عوامل نے اسے مشکل بنا دیا ہے۔ اس میں بعض مباحث ایسے آ گئے ہیں جن کو اس سے پہلے چھیڑا ہی نہیں گیا۔ اسے پڑھنے کے بعد مذہبی جمود و تعصّب کی غلط گرفت بالکل کمزور پڑ جاتی ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

اسلام اور موسیقی جمالیات بھی دین ہی کا ایک حصّہ ہے اور خوش آوازی بھی جمالیات ہی کا ایک گوشہ ہے۔ سیدنا داؤد سے لے کر آج تک کے انبیاء، اولیاء، مجتہدین و فقہا، ائمہ و صوفیاء، علماء و صلحاء کا موسیقی و سماع کے متعلق کیا رجحان ہے۔ کتاب و سنت اس بارے میں کیا کہتی ہیں۔ اہل علم کے اس بارے میں کیا اختلافات ہیں۔ محدثین اور فقہاء اور صوفیہ کے کیا مسلک ہیں۔ ان تمام مباحث پر اردو زبان میں اتنا مواد اس سے پہلے کبھی یکجا نہیں کیا گیا۔

موسیقی کے بارے میں اسے ایک فیصلہ کُن، سنجیدہ اور منصفانہ تصنیف سمجھنا چاہیئے قیمت تین روپے ۸ر

دیگر مطبوعات کے لئے فہرست کتب مفت منگوائیں۔

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

کتابوں کا بہترین علمی ذخیرہ

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
عقائد و اعمال	۱۲/	قرآن اور علمِ جدید	۵صہ/۸
اسلام میں حریت۔ مساوات۔ اخوت	عہ/	بیدل	۶ے/۸
اسلام اور حقوقِ انسانی	عہ/۴	فقہ عمر	للعہ/
اسلام کا معاشی نظریہ	عہ/۸	افکار ابنِ خلدون	۳ے/۸
دینِ فطرت	عہ/۸	افکارِ غزالی	۷عہ/
اسلام کی بنیادی حقیقتیں	۲عہ/۸	مسئلہ زمین	۲ے/۸
اسلام کا نظریۂ تعلیم	عہ/	طب العرب	۲ے/
اسلام کا نظریۂ اخلاق	عہ/۱۲	حکمتِ رومی	۳ے/
علمِ تصوف	عہ/	مذاہبِ اسلامیہ	۵ہ/
خلافت اسلامیہ	۵صہ/۸	اسلام میں حیثیتِ نسواں	۳ے/
اصول فقہ اسلامی۔	۲عہ/۸	اسلام اور رواداری	۶ہ/
اسلام کا نظریۂ تاریخ	۳ے/	حیاتِ محمدؐ	اٹھارہ روپے
تہذیب و تمدن اسلامی حصۂ اوّل	۵صہ/	مآثر لاہور۔ (حصۂ اوّل)	ے/
″ ″ حصۂ دوم	۶ے/۸	مقامِ انسانیت	عہ/
″ ″ حصۂ سوم	۵صہ/۱۲	ملفوظاتِ رومی	ے/
مسئلہ اجتہاد	عہ/۸	ماہوار "ثقافت"	۱۲/

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

(اشرف پریس ۷۔ ایبک روڈ لاہور میں باہتمام شیخ محمد اشرف پرنٹر چھپوا کر شائع کی۔)

زیردستوں کی آقائی

یعنی

طٰہٰ حسین مصری کی ایک معرکہ آرا کتاب "الوعد الحق"
کا شگفتہ ترجمہ جس کے آغاز میں طٰہٰ حسین کے
سوانح زندگی بھی شامل کر دئیے گئے ہیں

از

مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی

یکے از مطبوعات

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ لاہور